جمیل الدین عالی کی نثر نگاری

عبدالعزیز ساحر

جمیل الدین عالی کی نثر نگاری

عبدالعزیز ساحر

پاکستان رائٹرز کواپریٹو سوسائٹی

۷۰- شاہراہ قائداعظم، لاہور

انتساب

استاد گرامی ڈاکٹر محمد احسان الحق کے نام

احسان صاحب کے لئے ایک نظم

وہ جب اشک سحر گاہی سے دامن کو مثال گل
بھگو لیتا ہے شبنم سے
تو اس کے پردہ دل میں مہک اٹھلانے لگتی ہے
وہ خوشبو کی طرح معمور کرتا ہے فضاؤں کو
تو اس کی چاپ سے کلیوں کے پیراہن
خیال رنگ و بو میں ڈوب کر ایسے نکھرتے ہیں
کہ جیسے سوچ کے منظر تراشے ہے کوئی آذر
کہ جیسے دائرے پر دائرہ بنتی چلی جائیں
خیال و فکر کی کرنیں
کسی کے آستانے تک

عبدالعزیز ساحر

ترتیب

پیش لفظ

عارضہ قلب کے حملے اور پے بہ پے صدموں کے بعد میرے دوست جمیل الدین عالی کے طرز زندگی یا کم از کم ان کے انداز نظر میں خاصی تبدیلی آگئی ہے۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کسی گوشتہ عافیت میں زندگی کے بقیہ ماہ و سال گزرانے کے منصوبے بناتے ہیں، کبھی وہ یہ سوچتے ہیں کہ انجمن ترقی اردو کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوجائیں، کبھی یہ خیال کرتے ہیں کہ اپنی تیس سالہ اظہاریہ نویسی بھی ترک کردیں اور اپنی تمام صلاحیتوں اور ذہنی یکسوئی کے ساتھ اپنی طویل نظم "انسان" کو مکمل کرنے میں لگ جائیں اور اس لگن میں وہ غالب کے اس انتباہ کو بھی خاطر میں نہیں لاتے کہ

"سخت دشوار ہے انساں کا انساں ہونا" انداز نظر کی اس تبدیلی اور ایک بڑی نظم کو مکمل کرنے کی دھن کے باوجود وہ ایک ایسے شاعر ہیں جن کے دوہے، غزلیں، گیت ان کے مداحوں کے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں، ساتھ ہی وہ ایک ایسے صاحب فکر ادیب ہیں جن کے اظہاریئے انہیں توجہ کا مرکز بنائے رکھتے ہیں اور نظم و نثر کے ان کمالات کے علاوہ وہ ایک پرکشش شخصیت کے مالک بھی ہیں۔ چنانچہ ہر غیر ضروری چیز سے کنارہ کش ہونے کے ارادے کے باوجود وہ گوناگوں مصروفیات میں گھرے رہتے ہیں۔

چند مہینے ہوئے ایک دن انہوں نے مجھے فون کیا کہ ان کے پاس ایک ذی علم نوجوان آئے ہیں جو غالب اور وجودیت کے موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ کچھ شاعروں اور ادیبوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں، کیا یہ ممکن ہوگا کہ میں اس موضوع پر ان سے تبادلہ خیال کے لئے کچھ وقت نکال سکوں۔ میں راضی ہوگیا۔ تھوڑی دیر بھی نہ ہوئی ہوگی کہ عالی صاحب کے ڈرائیور نے ذی علم نوجوان کے آنے کی اطلاع دی۔ علیک سلیک کے بعد میں نے سوال کیا کہ غالب اور وجودیت کے موضوع سے ان کی دلچسپی کا محرک کیا ہے۔ انہیں کچھ حیرت ہوئی، انہوں نے وضاحت کی کہ انہیں غالب اور وجودیت سے نہیں بلکہ غالب اور وحدت الوجود کے موضوع سے دلچسپی ہے۔ موضوع کی اس تبدیلی سے مجھے سہولت ہوگئی کیونکہ میں دو مہینے پہلے قومی زبان کے لئے "غالب اور تصوف" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ چکا تھا۔ البتہ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ عالی صاحب نے وحدت الوجود کو وجودیت کیوں سمجھا۔ ایک تو سیدھی سادھی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ ان کا ذہن اپنے دانشور

دوستوں کی گفتگو میں اس طرح الجھا ہوا ہو کہ وہ اس نوجوان کی بات پوری توجہ سے نہ سن سکے ہوں اور دوسری توجیہ یہ ہو سکتی تھی کہ وہ اقبال کی طرح تصوف کے عجمی تصورات کو مسلمانوں کے ضعف عمل کا سبب سمجھتے ہوں اور ان کے تحت الشعور نے وحدت الوجود کو رد کر کے وجودیت کر دیا ہو۔

بہرحال اس نوجوان سے میری گفتگو خاصی دلچسپ رہی کیونکہ اس کی وابستگی حضرت پیر مہر علی شاہ کے سلسلہ عالیہ سے ہے جن سے اقبال نے ابن عربی کے حوالے سے زمان و مکان کے تصورات کو سمجھنے کی خواہش کی تھی لیکن پیر صاحب کی بیماری اور پھر ان کے وصال کے سبب اس کی نوبت نہ آسکی۔ غالب کو بھول کر ہم زیادہ تر حضرت ابن عربی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ یہ جان کر مجھے اور حیرت ہوئی کہ یہ نوجوان بابا ذہین شاہ صاحب کے کلام، مسلک اور مقام سے گہری واقفیت رکھتا ہے۔ غرض دیر تک ہم دونوں اپنی دلچسپی کے مشترک موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ اس نوجوان کی روانگی سے پہلے میں نے اس سے پوچھا کہ وہ عالی صاحب کو کیسے جانتا ہے۔ تو اس کے جواب نے مجھے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے بتایا کہ عالی صاحب کی نثر نگاری پر اس نے ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے جو شاید کچھ عرصے بعد کتابی شکل میں شائع ہو جائے۔ یہ تھا میرا تعارف اس کتاب کے مصنف عبدالعزیز ساحر سے۔ مصنف کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس کی کتاب کی اشاعت کا اہتمام ہمارے ادارے کی جانب سے کیا جارہا ہے۔ کون کہتا ہے کہ زندگی میں ڈرامائی اتفاقات نہیں ہوتے۔

اب میں اس کتاب کے موضوع کی طرف آتا ہوں۔ عالی صاحب کو مجھ سے یہ شکایت رہی ہے کہ میں نے ایک طویل رفاقت اور قرابت کے باوجود کبھی سنجیدگی سے انہیں سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ان کی شخصیت کو اور نہ ان کے فن کو۔ میرا جواب یہ ہے کہ آخر سنجیدگی سے گرانبار ہونے کی کیا ضرورت ہے جب۔

"روشن ہے ان کا حال ہر اک پر کہے بغیر"

ان کی شخصیت ایسی صاف اور شفاف ہے، ان کے خدوخال اتنے واضح ہیں اور ان کے کارنامے اتنے نمایاں ہیں کہ ان کو سمجھنے میں عصبیت کے علاوہ اور کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ میرے اور ان کے درمیان اس قسم کے کسی حجاب کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا۔ البتہ ان کی شکایت کا اگر کوئی جواز ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ میں اپنی فطری کاہلی کے سبب ان کی کتابوں کا اس توجہ سے مطالعہ نہ کر سکا، جس کی وہ مستحق ہیں، اور اسی لئے اب تک ان پر اظہار خیال کرنے سے قاصر رہا۔ مجھے اپنی اس کوتاہی کا اعتراف ہے، لیکن یہ پیش لفظ لکھتے وقت مجھے یہ خوشی ہے کہ وحدت الوجود کی وادی میں گم گشتہ ایک نوجوان نے عالی کی شخصیت اور فن کے ساتھ انصاف کرنے میں کوئی کمی نہیں کی اور ان سطور کے تحریر کرنے سے مجھے وہ موقعہ فراہم کردیا جس سے میں شاید عالی کی شکایت کا کچھ ازالہ کرسکوں۔

عالی کو قدرت نے بڑی فیاضی سے نوازا ہے۔ ایک طرف وہ انجمن ساز ہیں، دوسری طرف انجمن آرا ہیں اور اس کے علاوہ بجائے خود ایک انجمن بھی ہیں۔ ان کی انجمن سازی کا کارنامہ رائٹرز گلڈ تھی۔ ان کی انجمن آرائی کا کرشمہ انجمن ترقی اردو ہے، اور ان کی ذات میں انجمن کا جلوہ دیکھنا ہو تو کسی مشاعرے میں ان کی نغمہ سرائی دیکھ لیجئے یا کسی محفل میں ان کے انداز گل افشانی گفتار کا تماشا کیجئے۔ پہلے ان کی انجمن سازی کو لے لیجئے۔ اپنی ذہنی اور ادبی اٹھان کے زمانے میں انہیں ایک موقعہ ملا اور انہوں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھا کر تمام پاکستانی زبانوں کے شاعروں، ادیبوں، اور اہل فن کو ایک ایسی ملک گیر تنظیم سے وابستہ کردیا، جو آپ اپنی نظیر تھی۔ اس سلسلے میں قدرت اللہ شہاب کا ایک جملہ دہرانا کافی ہے "گلڈ کی تنظیم و تعمیر کا سہرا دراصل جمیل الدین عالی کے سر ہے"

رائٹرز گلڈ سے کہیں زیادہ اہم ادارہ انجمن ترقی اردو ہے۔ مولوی عبدالحق کے بعد یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں انجمن کا شیرازہ نہ بکھر جائے۔ اس وقت مشفق خواجہ کے الفاظ میں "اختر حسین مرحوم کا نام اور عالی صاحب کا کام انجمن کی حیات نو کا ضامن ہو گیا" آگے چل کر خواجہ صاحب لکھتے ہیں "جمیل الدین عالی، انجمن ترقی اردو میں مولوی صاحب کے جانشین اور ان کی قائم کردہ علمی و ادبی روایات کے امین ہیں" اس سے بڑھ کر خراج تحسین اور کیا ہو سکتا ہے۔ ان دو اہم اداروں کی تاسیس اور تعمیر میں کلیدی کردار ادا کرنے کے باوجود وہ ان اداروں سے اس وابستگی کی قید سے آزاد رہے جو فروغ ذات کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ جمیل الدین عالی نے سرکاری اور غیر سرکاری زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے، کئی اہم اداروں میں ممتاز مناصب پر فائز رہے اور مختلف نوعیت کی آزمائشوں

سے گزرے، لیکن اس کے بعد بھی ان کا خودشناسی اور تخلیق کا سفر جاری ہے۔ اور یہ بات کم کسی کو نصیب ہوتی ہے۔

اس سفر میں وہ تخلیق کار جو نظم اور نثر دونوں پر قادر ہو اپنے احساس اور تجربے کے اظہار کے لئے نظم کو اپناتا ہے اور اپنی فکر اور مشاہدے کے ابلاغ کے لئے نثر کا وسیلہ اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ عالی کی غزلوں اور دوہوں میں ان کے احساس کی نزاکت اور تجربوں کی لطافت بلکہ قیامت جھلکتی ہے اور ان کی نثر میں ان کے افکار و خیالات اور مشاہدات کی عکاسی نظر آتی ہے، عالی کو نظم اور نثر دونوں میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوانے میں کامیابی حاصل ہوئی، عالی کے دوہے تو ان کی شناخت بن گئے ہیں۔ احساس کی نشاط سے جھوم کر وہ دوہے کہتے ہیں، اور جب وہ اک کیف میں ڈوب کر اپنے سحر انگیز لحن میں پڑھتے ہیں تو محفل پہ چھا جاتے ہیں۔ انہیں کچھ عرصے سے یہ خیال پریشان کرنے لگا ہے کہ شاید ان کے ترنم کی آمیزش نے ان کے دوہوں کے تاثر کو بڑھا دیا ہے، اس لئے اب وہ دوہے کہنے اور پڑھنے میں ذرا محتاط ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کی یہ احتیاط درست نہیں ہے، بعض وقت ایک لطیف خیال وارد ہی ایک خاص بحر اور دھن میں ہوتا ہے، اس سے بے التفاتی شاعر کو زیب نہیں دیتی۔ یہاں چونکہ عالی کی نثر ہمارا موضوع ہے لہٰذا میں ان کی شاعری کے بارے میں بات کو آگے بڑھانے سے احتراز کروں گا۔

عالی کی نثرنگاری کا آغاز ان کے خاکوں سے ہوتا ہے، اختر الایمان اور سائل دہلوی کے خاکے لکھنے کے بعد ان کی خاکہ نویسی پس منظر میں چلی گئی اور ان کی تمام توجہ سفرناموں پر مرکوز ہو گئی۔ انہیں دوسرے ملکوں میں سفر کرنے کے مواقع میسر آتے رہے اور انہوں نے ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ دوسرے ملکوں کے ادیبوں سے راہ و رسم پیدا کی، ان کے طرز فکر کو سمجھنے کی کوشش کی، باہر کی دنیا کو برصغیر کی اقدار سے پرکھا، اور اپنے وطن سے دور ہو کر معروضیت سے اس کا مطالعہ کیا، اور غیروں کی نظر سے اپنے محاسن اور معایب کو جانچا۔ اس طرح ان کے سفرنامے ان کے اپنے تاثرات کا آئینہ بننے کے ساتھ ان ملکوں پر جہاں وہ گئے ایک پاکستانی ادیب کا تبصرہ بھی بن گئے۔ چنانچہ ان کی اتنی پذیرائی ہوئی کہ بعض غیر ملکی زبانوں میں ان کے ترجمے بھی ہوئے، خاص طور پر روسی زبان میں جو انہیں پڑھ کے سنائے بھی گئے۔ اس پذیرائی کے ساتھ احتجاج بھی ہوا۔ ایران سے متعلق ان کے سفرنامے

پر ایرانی سفارت خانے کی طرف سے سخت اعتراض کیا گیا اور اس کے نتیجے میں ایران میں ان کے داخلے پر پابندی لگادی گئی۔ احتجاج اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے جو کچھ دیکھا اسے بے کم و کاست لکھ دیا۔ لیکن جس ملک کی طرف سے سخت احتجاج ہونا چاہئے تھا وہاں سے کوئی آواز نہیں اٹھی' اس لئے کہ عالی نے جو لکھا تھا وہ اس دیانتداری اور جذبے سے لکھا تھا کہ شاید احتجاج کرنے والے خود شرمندہ ہو گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عالی کا سب سے پر تاثر اور درد انگیز سفرنامہ وہ ہے جس میں انہوں نے دلی میں ایک رات گزارنے کا ذکر کیا ہے۔ چند اقتباسات دیکھئے۔

"دلی میرا پہلا پردیس ہے جسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہاں مجھے کسی رہنما' کسی ترجمان کی ضرورت نہیں ہے.... میرے گھر میں ہندو شرنارتھی بیٹھے ہیں' میری ننھیال اور ددھیال دونوں اجڑ چکی ہیں' میرے دوست یار مارے گئے یا بھاگ گئے۔ کاش میں ماسکو نہ جاتا' (اس زمانے میں کراچی اور ماسکو کا براہ راست ہوائی رابطہ نہیں تھا' فضائی سفر دلی کے راستے ہی ممکن تھا) کسی لاش کے سرہانے کھڑے رہنا کوئی خوشگوار بات نہیں ہے....یہاں میری خاندانی ہرواڑ بھی ہے۔ میرے دادا علاؤ الدین خان علائی یہاں دفن ہیں اور میرے چچا ضمیر الدین خان عالی بھی جن کا تخلص میں نے اڑا لیا تھا۔ خاندانی رواج کے مطابق میں بھی یہیں دفن ہوتا مگر اب نہ جانے کہاں دفن ہوں گا..."

"اور یہ قطب کی لاٹھ آج کتنی عجیب لگ رہی ہے... وہاں سے اس لاش کا منظر بہت صاف دکھائی دیتا جس کا نام دلی ہے۔ قطب کی لاٹھ کی بھی ایک تاریخ ہے مگر آج میں مورخ نہیں ہوں... دلی کیا تمہارے باپ کی جائیداد ہے جو آہیں بھر رہے ہو' انقلابات میں تمہاری یا تمہاری دلی کی کیا بساط ہے۔ کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ اپنے نئے وطن میں اپنے اسلامی نام کے باوجود آزادی سے گھومتے پھرتے ہو... یہ آواز کس کی ہے۔ شاید تاریخ کی۔ تاریخ جو بیدردی کی حد تک صاف گو ہے...."

"پاکستان جو میری پناہ گاہ ہے' جو میرا گھر ہے' میرا وطن ہے۔"

اس مختصر سے سفرنامے میں سب کچھ آگیا۔ وقت کے ہاتھوں ایک تہذیب اور تمدن پر توڑے جانے والے مظالم کی داستان جس نے اس تمدن کے فرزندوں کو دیس نکالا دے کر ایک نئے وطن میں آباد ہونے کا حوصلہ دیا' جو ان کے لئے پناہ گاہ بھی ہے اور مستقبل کی

ضمانت بھی۔

میرے دوست عبدالمجید مفتی جو اپنی سرکاری زندگی میں کئی بار ہندوستان کا سفر کر چکے ہیں۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے وہ جب بھی ہندوستان میں کسی ایسے شخص سے ملے جو صوبہ سرحد یا پنجاب سے ترک سکونت کر کے دلی یا بمبئی میں جا بسا ہے تو اسے اپنے صوبے' اپنے شہر' اپنے محلے کی یاد میں ڈوبا ہوا پایا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے اپنے ماضی کی محبت سے مغلوب ہو جاتا تھا اور اپنے نئے وطن میں اجنبیت کے احساس کا ذکر کرتا تھا۔ اس کے برعکس ہندوستان سے آنے والوں میں یہ جذبہ اس شدت سے نظر نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ ہندوستان سے جو مسلمان یہاں آئے ہیں وہ تو اسی معاشرت میں آئے ہیں جس میں وہ وہاں زندگی گزارتے تھے۔ اقبال اور فیض وہاں بھی ان کی زندگی کا حصہ تھے' اور میر اور غالب آج بھی یہاں سب کا مشترک ورثہ ہیں۔ لہٰذا وہاں سے آنے والے کسی اجنبیت سے دوچار نہیں ہوئے۔ اس کے علاوہ وہاں وہ ایک بے رحم اکثریت کے مظالم کا شکار تھے اور یہاں سے جانے والے اقلیت میں ہونے کے باوجود معاشرے میں شریک غالب کا درجہ رکھتے تھے' وہ وطن کے ساتھ اپنے اثر اور رسوخ کے غلبے سے بھی محروم ہوئے۔ اسی لئے ایک اجنبی ماحول میں ان کا احساس محرومی زیادہ شدید ہے۔ وہاں سے آنے والے تو غالب کے اس شعر سے اپنا غم غلط کر لیتے ہیں۔

کرتے کس منھ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تو کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

آیئے اب عالی کے اظہاریوں کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ "صدا کر چلے" کے پہلے ہی اظہاریئے کو دیکھئے جس میں وہ کامیابی کے تصور سے بحث کرتے ہیں' اس کا آغاز وہ عجب بانکپن سے کرتے ہیں۔

"دیکھا کہ ایک وسیع و عریض کمرہ ہے۔ نہایت آراستہ' چاندنی کا فرش' اس پر بڑا سا قالین' اوپر جھاڑ فانوس' چاروں طرف دبیز اطلس کے پردے' مخمل کی مسندیں' ان کے کونوں پر کارچوبی ترنجیں بنی ہوئی۔ کلابتو کی جھالریں لگی ہوئی' مشجر کے گاؤ تکیے۔ سامنے چاندی کی چنگیروں میں جوہی کے گجرے' گجروں پر بھاری تورہ پوش۔ آگے حسن دان' ان سے ملے ہوئے گنگا جمنی ناگردان' ان میں سرخ ٹول کی گیلی گیلی صافیاں' صافیوں پہ لچکے اور

چمپا کی ٹکائی۔ منقش اگالدان جن کے نیچے مخمل کے کارچوبی زیرانداز تھے۔"

یہ دلی کی ایک ڈیرہ دار طوائف کے کوٹھے کا منظر ہے جہاں شکیل بدایونی کے اصرار پر عالی کو اٹھارہ انیس سال کی عمر میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں ڈیرے کے منتظم نے دونوں کا استقبال کیا۔ ان کا حلیہ عالی کے الفاظ میں سنئے۔

"ادھیڑ عمر' گھنی گھنی کھچڑی مونچھیں عجب بہار دے رہی تھیں' اشرفی بوٹی کی چکن کا کرتا' جامہ دار کی شیروانی۔ زیب تن کا چوڑی دار پاجامہ جس کی سیونوں پر ہاتھ سے کیکری کی سلائی کی ہوئی تھی۔ سفید اور سنہری تسر کی پگڑی' دونوں ہاتھوں میں موتی چور کے چھلے' دائیں چھنگلی میں موٹے فیروزے کی انگوٹھی۔ آنکھوں میں سنہری فریم کی عینک۔" اب ذرا ان کے انداز گفتگو کے بارے میں بھی کچھ سنئے۔

"تس پر ان صاحب نے ایک مختصر مگر جامع تقریر ہمارے بزرگوں کی فن نوازی وغیرہ پر کی۔ حضرت خواجہ میر درد کے اشعار جستہ جستہ سنائے۔ غنا اور مضامیر پر مختلف صوفیاء کے تائیدی خیالات کا حوالہ دیا۔ خود ہمارے طور طریق' نشست و برخاست اور صورت شکل کی توصیف بھی کی"۔

پھر منتظم نے یہ کہا کہ اس ڈیرے کی یہ روایت ہے کہ جو کرم فرما پہلی مرتبہ سرپرستی فرماتے ہیں تو انہیں ریشمی پارچوں کا ایک گلدستہ پیش کیا جاتا ہے۔ اندر جاکر ایک چینی کا مرتبان اور چاندی کی طشتری لائے اور پھر مرتبان سے ریشم کا ایک گچھا نکال کر ہوا میں لہرایا اور طشتری میں پھیلا کر اسے عالی کی خدمت میں پیش کیا۔ اب ریشمی پارچوں کا حال سنئے۔

"دیکھتے ہیں کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے تاش برابر بے شمار رومال ایک دوسرے کے ساتھ سلے ہوئے ایسے لگ رہے ہیں جیسے آجکل کا کیوبک آرٹ۔ فرق یہ تھا کہ ان میں ایک ترتیب اور امتزاج رنگ کا اندازہ ہوتا تھا۔ گلابی' فیروزی' کاسنی' بسنتی' زرد' سرخ' نارنجی' ارغوانی' بنفشی' کتھئی' سیاہ' پستئی' شفتالو' پیازی' قرمزی' کرمچی اتنے رنگ تو یاد ہیں۔ شاید اور بھی ہوں۔ بس ایک گلدستہ رنگ و نقش تھا۔ اس منظر سے زیادہ خوبصورت شاید کسی کی محبوبہ ہی ہوتی ہوگی"۔

ایک بالا خانے کے مناظر کا مشاہدہ عالی صاحب نے اس غور سے اور اس کا بیان اس تفصیل سے کیا ہے کہ اس پر محتسب کے میخانے میں ورود کا دھوکہ ہوتا۔

محتسب یہ دانہ تسبیح پر گنتا رہا۔ کس نے پی، کس نے نہ پی، اور کس کے آگے جام تھا

دوسرے مصرعے میں کے، کو میں "کس" سے بدل دیا ہے اس لئے کہ "کے" کی تکرار سے ایک نازک مزاج کو قے کا اندیشہ ہونے لگا تھا۔

ڈیرے کے منتظم کا ذکر بڑے ذوق وشوق سے کیا گیا ہے لیکن ڈیرے والی سے جس کے دم سے وہ ڈیرہ آباد تھا عالی نے بہت توجہی برتی ہے۔ اس کے بارے میں صرف یہ کہا ہے کہ وہ ایک مشہور گانے والی تھی جو حیدر آباد کے ایک شہزادے کی منظور نظر رہ چکی تھی۔ اس اخفا سے قطع نظر اس اظہاریئے میں عالی کی رعنائی گفتار قابل دید ہے جو ان کے بعد کے کاروباری اور مسائل سے لبریز اظہاریوں میں نظر نہیں آتی۔ اس اختلاف کے باوجود اس اظہاریئے کا اختتامیہ بہت لائق غور ہے، وہ ایک کوٹھے کے منتظم کی کامیاب زندگی سے جسے انہوں نے کراچی میں کافی آسودہ حال پایا جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ ملاحظہ کیجئے۔

"کیا آپ کے خیال میں ہماری صدی، ہماری دنیا، ہمارے معاشرے میں سب محنت کرنے والوں کو آگے بڑھنے کے لئے برابر کی سہولتیں حاصل ہیں، اگر نہیں ہیں تو ناکاموں کی ناکامی میں کن عناصر کا کتنا دخل ہے اور کامیابوں کی کامیابی میں ظلم، ناانصافی اور ناہمواری کی روایات کا کتنا حصہ ہے۔ کچھ ہے تو کاہے کی ناکامی اور کاہے کی کامیابی"۔

دیکھا آپ نے عالی صاحب اپنے ابتدائی دور کے اظہاریوں میں بھی ایک طوائف کے کوٹھے کے ذکر سے جس میں انہوں نے اپنی رعنائی تحریر کے جوہر دکھائے کیسے اہم نتیجے اخذ کرتے ہیں۔ ابھی چند سال پہلے میں نے ان کا ایک کالم دیکھا تھا جس میں، اندرون سندھ کے ایک دور افتادہ گاؤں میں زندگی کی بنیادی ضرورت پانی کے مہیا ہونے کا کوئی انتظام نہیں تھا اور انسان اور جانور ایک ہی گندے تالاب پر گزارا کر رہے تھے۔ اس گاؤں کا نام ہے حاجی جانی رند۔ جانی اور رند میں طوائف کے ڈیرے اور حاجی کے لفظ میں ایک پارسا منتظم کی جھلک نظر آتی ہے۔ تالاب کے پانی میں اس قدر غلاظت اور عفونت تھی کہ کوئی شہر والا اس کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ اس منظر کے بیان سے عالی پر جو کیفیت طاری ہوئی وہ اس تاثر سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی جس سے وہ ایک طوائف اور اس کے منتظم کی کامیابی دیکھ کر دوچار ہوئے تھے۔ بات یہ ہے کہ وہ ایک شاعر اور ادیب کی خودنگری کے باوجود بنیادی طور پر ایک بہت دیانتدار آدمی ہیں، انہیں جہاں ناانصافی نظر آتی ہے وہ اس کے خلاف احتجاج

کرتے ہیں، حد یہ ہے کہ وہ انسانیت کے اس اہل درد طبقے کا بھی احتساب کرنے سے باز نہیں آتے جسے لوگ شاعر سمجھ کے احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے دور انحطاط کے ایک ممتاز شاعر کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں...

"دور کیوں جایئے، نواب مرزا خاں داغ کا کلام ملاحظہ فرمایئے۔ ان کے بے شمار اشعار سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک نہایت ذہین اور حساس انسان تھے۔ پھر یہ کیا قصہ ہے کہ ان کے چار دیوانوں میں کم ایسے شعر ملتے ہیں جن میں ان کے زمانے کی دکھی انسانیت کے پرتو نظر آئیں ایک لے دے کے دلی کا شہر آشوب ملتا ہے۔"

فلک زمین وملائک جناب تھی دلی

مگر اس میں صرف اپنے ہی طبقے کی تباہی کا احساس غالب ہے۔ ان کے اردگرد برسوں سے کسان، مزدور، شہری، غرباء، غرضیکہ ہجوم در ہجوم افراد جبر، ظلم، بھوک، بیروزگاری ارو سماجی نا انصافی کا شکار تھے۔ کیا وہ لوگ انہیں نظر نہیں آتے تھے۔ کیا وہ کبھی دیہات نہیں جاتے تھے۔ کیا وہ شہروں میں سوکھے جسم اور بھوکی روحیں نہیں ملاحظہ کرتے تھے۔ کیا انہیں برطانوی مظالم کے علاوہ مقامی جاگیرداروں کے استبداد اور استحصال کا علم نہیں ہوتا تھا۔ پھر کیا تھا کہ ایسے قادر الکلام، حساس اور ذہین شاعر کے اتنے ضخیم کلام میں واردات ہی واردات ملتی ہے، معاملات ہی معاملات نظر آتے ہیں"

دیکھا آپ نے عالی نے اپنے ہم وطن شاعر نواب مرزا خاں داغ دہلوی کو جو ان کے چچا اور ممدوح نواب سراج الدین خاں سائل کے سسر بھی تھے کیسے آڑے ہاتھوں لیا ہے، ان کی تنقید صرف دور انحطاط کے عیش پسند رجحانات کی عکاسی کرنے والے شعرا تک نہیں تھی۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کے ممتاز ترین شاعر کو بھی اپنی عقیدت اور مداحی کے باوجود نہیں بخشا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"پچھلے زمانے میں ترقی پسند تحریک بڑے زور سے چلی۔ آج اس کا انتظامی ڈھانچہ تک ختم ہوگیا لیکن تحریک آج بھی جاری ہے، بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ پھیل گئی ہے۔ لیکن آج بھی جب بڑے شاعر اس قسم کا شعر کہیں۔

آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

تو میرے منہ میں خاک، چھوٹا منہ بڑی بات' وہ کس کی ترجمانی کررہے ہیں۔ اگر شارحین کرام مجھے اس کی کوئی ترقی پسندانہ شرح لکھ بھیجیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کالم میں شائع کردوں گا"

عالی کسی تحریک سے تعلق نہیں رکھتے' وہ کسی نظریئے کے مبلغ نہیں ہیں' وہ کسی اصلاحی ادارے کے رکن بھی نہیں لیکن وہ اقدار کی پامالی کے روادار نہیں ہیں' وہ ناانصافی پر خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔ یہی تاثر کا اخلاص اور ناانصافی پر احتجاج ان کی اظہاریہ نگاری کا امتیاز ہے' اور شاید اسی لئے اپنے اور بیگانے ان سے شاکی نظر آتے ہیں۔

عالی صرف حال کے مسائل سے بے توجہی کے شکوہ سنج نہیں ہیں۔ انہیں یہ بھی گلہ ہے پاکستان کے دانشور مستقبل سے بالکل بے نیاز ہیں۔ مستقبل سے ان کا شغف دیدنی ہے۔ شاعر عام طور پر ماضی میں گم رہتے ہوئے مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں۔ غالب کو اپنے ماضی کی رنگارنگ بزم آرائیاں یاد تھیں' وہ گلفروش شوخی داغ کہن تھے لیکن ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو عندلیب گلشن ناآفریدہ بھی کہتے تھے۔ اور اپنے کلام کی مقبولیت کے بارے میں ان کا یہ اعلان تو حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔

"شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن"

اسی طرح اقبال کا کلام اسلام کے شاندار ماضی' عظیم روایات اور تاریخی کارناموں سے مملوہے اور ساتھ ہی ملت کے لئے ایک درخشاں مستقبل کی نوید کا حامل بھی۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

مستقبل سے غالب کا رشتہ اپنی ذات کے تعلق سے تھا اور اقبال کا ملت کے حوالے سے۔ جمیل الدین عالی نے چونکہ مستقبل کے بارے میں اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ نثر کو بنایا ہے اس لئے انہوں نے شاعرانہ افراط و تفریط سے بچ کے اپنے لئے ایک درمیانی راستہ متعین کیا ہے' وہ ملک اور قوم کی بات کرتے ہیں۔ قوم کی محبت نے انہیں ہجرت کرکے ایک نئے وطن میں لابسایا' اس وطن سے انہیں تقریباً ویسی ہی محبت ہے جیسی یورپ سے امریکہ میں جابسنے والوں کو اپنے نئے وطن سے ہے۔ چنانچہ جب اس وطن پر اہل وطن کی کم اندیشی اور بدمعاملگی سے تباہی کے مہیب سائے پڑتے ہیں تو وہ بے قرار ہوجاتے ہیں'

اور اپنے اظہاریوں میں فریاد کر کے انہیں آنے والے خطرات کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کا یہ موقف بلکہ ایقان ہے کہ یہ ملک لامحدود امکانات سے مالامال ہے' یہاں کے دریا' جنگل' پہاڑ اور معدنیات قدرت کی فیاضی کا کرشمہ ہیں' یہاں کے عوام محنت اور جفاکشی میں بے مثال ہیں' اگر انہیں تعلیم کے مواقع میسر آئیں' انہیں زندگی کی بنیادی سہولتیں مہیا کی جائیں' انہیں معاشرتی انصاف اور ترقی کی مساوی سہولتوں سے محروم نہ رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ملکی وسائل کے خاطر خواہ استعمال سے اپنے قومی تشخص کو اقوام عالم میں ایک اہم مقام دلانے سے قاصر رہیں۔ اپنی سرکاری ملازمت اور پھر ایک خاصی طویل مدت تک بینک سے وابستگی کی وجہ سے وہ اپنے موقف کے ثبوت میں اعداد و شمار استعمال کرتے ہیں' صحیح پیش بینی اور جامع منصوبہ بندی کے لئے شماریات کی اساس لازمی حیثیت رکھتی ہے' عالی نے اپنی تحریروں سے پوری قوم کو مستقبلیات کی طرف متوجہ کیا ہے۔ جب تک ہم اپنی قومی آمدنی کا ایک معتدبہ حصہ انسانی وسائل کے فروغ پر صرف نہیں کریں گے ترقی کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ عالی کی اظہاریہ نگاری کا ایک بہت مثبت پہلو یہ ہے کہ وہ مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرنے' مستقبل کے امکانات کا نقشہ دکھانے اور مستقبل کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے فوری منصوبہ بندی اہمیت پر زور دینے سے کبھی نہیں تھکتے۔ اس طرح انہوں نے مستقبلیات (Futurology) کو پہلی بار ملک میں ایک باقاعدہ موضوع کی طرح متعارف کرایا۔ "مستقبلیات" سے یہ گہری وابستگی دراصل ان کی "پاکستانیت" ہی کی ایک شکل ہے۔

اظہاریوں میں عالی نے جو طرز تحریر اپنایا ہے وہ بہت عام فہم ہے اس لئے کہ ان کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو صرف اخباروں پہ گزارا کرتے ہیں۔ نہ ان کے پاس اتنے وسائل ہیں کہ وہ کتابیں خریدیں' نہ اتنی فرصت کہ انہیں پڑھیں۔ لہٰذا عالی نے ان کو اہم موضوعات سے متعارف کرا کے ایک اجتماعی فکر پیدا کرنے کی خاطر ایسی زبان استعمال کی ہے جو ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آجائے۔ اس لئے وہ عام بول چال کے الفاظ جیسے "پھڈا" وغیرہ بے تکلفی سے لکھ جاتے ہیں۔ یہی ان کے کالموں کی مقبولیت کا راز ہے۔ اور شاید یہ ہی عوامی لہجہ ان کے' کشادہ جبین' پڑھنے والوں پر گراں گزرتا ہے۔ ان کی شکایت رفع کرنے کے لئے کبھی کبھی وہ فارسی اشعار میں اپنا درد دل بیان کرتے ہیں۔ بہرحال یہ بڑی بات ہے کہ

عالی نے اہم تاریخی، معاشرتی اور اقتصادی موضوعات کو سادہ سی زبان میں عوام تک پہنچایا ہے۔

سفرناموں اور اظہاریوں کے علاوہ جمیل الدین عالی نے انجمن کی ان کتابوں پر، جو ۱۹۶۳ء سے ۱۹۹۲ء تک شائع ہوئیں، مقدمے بھی لکھے ہیں۔ اس طرح انہوں نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے صحیح جانشین ہونے کا حق ادا کردیا ہے۔ دیباچہ نگاری کو جو وقعت مولوی صاحب نے دی تھی اسے برقرار رکھنے کے لئے بڑی محنت اور لگن کی ضرورت تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ گوناگوں مصروفیتوں اور اپنی ادبی زندگی کی مختلف جہات کے تقاضوں کے ساتھ وہ کس طرح اس محنت شاقہ کے لئے وقت نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے لکھے ہوئے مقدموں کی دو جلدیں حرفے چند کے عنوان سے شائع ہوچکی ہیں۔ مولوی صاحب کی قائم کردہ روایت کو بڑھاتے ہوئے عالی نے فروغ اردو کی لگن کے لئے بھی اسی دلسوزی سے کام کیا ہے جس کی توقع ان کے جانشین سے کی جاسکتی تھی۔ اس سلسلے میں دو کتابوں پر ان کے مقدمے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ جناب فرمان فتح پوری کی "اردو، یکجہتی اور پاکستان" اور سبزواری صاحب کی "اصلاحات بینکاری"۔ ان دونوں کتابوں کے مقدموں میں عالی نے اردو کے فروغ کی راہ میں حائل تمام مشکلات کا بڑی تفصیل اور وضاحت سے ذکر کیا ہے۔ پاکستان کے مختلف مراکز قوت کے ہاتھوں اردو کو جن مسائل سے دوچار ہونا پڑا ان کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔

"اگر ہمیں پاکستان میں قومی یکجہتی کا قیام واستحکام مطلوب ہے تو دوسرے سیاسی، سماجی، اقتصادی اقدامات کی اہمیت اپنی جگہ، لسانی سطح پر اس کا ذریعہ اردو اور صرف، اردو ہے، انگریزی یا کوئی دوسری زبان نہیں"۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ملک کسی سیاسی بحران سے دوچار ہوتا ہے یا ناگہاں انتخابات کا حادثہ پیش آجاتا ہے، اس وقت ہر شخص پوری قوم تک اپنی بات کو پہنچانے کے لئے اردو اور صرف اردو کا استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ اردو کے علاوہ کسی اور زبان کا استعمال کرے تو قومی سطح پر اس کی پذیرائی ناممکن ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ ہمارے سیاست دان اردو میں اپنا ماضی الضمیر اس شدومد سے بیان کرنے پر قادر ہوگئے ہیں کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ اردو ان کی مادری زبان نہیں ہے۔ اس

سلسلے میں سنہ ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں یہ دلچسپ صورتحال بھی دیکھنے میں آئی کہ ایک ممتاز سیاسی رہنما جنھوں نے چند سال پہلے اردو میں کسی سے بات نہ کرنے کی قسم کھائی تھی، اپنی تنظیم کا منشور ٹی-وی اور ریڈیو پر سکہ بند اصطلاحات سے مزین اردو میں پڑھنے پر مجبور ہوگئے۔ منشور پڑھنے کے بعد انہوں نے سوالوں کے جوابات بھی بغیر کسی تکلف کے خاصی روانی سے اردو مین دیئے۔ ملک گیر سطح پر اگر کوئی بات کرنا چاہتا ہے تو وہ اردو کے علاوہ کسی اور زبان کا انتخاب نہیں کرسکتا۔

اصطلاحات بینکاری کے مقدمے میں عالی صاحب نے اعلی سرکاری افسران کے رویئے کو نفاذ اردو کی راہ میں سب سے بڑی مشکل قرار دیا ہے۔ یہ بات وہ اپنے اظہاریوں میں مدت سے کہتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک دلچسپ بات کا انکشاف کیا ہے۔ انہوں نے وزارت تجارت کے برطانوی معتمد سرالیگزینڈر میک فارکر سے سنا کہ جی احمد صاحب کو انگرزی زبان میں اظہار خیال پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ کچھ عرصے بعد جب جی احمد صاحب معتمد وزارت داخلہ کے عہدے پر فائز ہوئے تو ان کی انگریزی دانی کی شہرت کے حوالے سے عالی نے ان سے سوال کیا کہ آپ کے بعد سیکریٹریٹ میں کون سب سے اچھی انگریزی لکھتا ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ آئی۔ سی۔ایس افسروں میں قدرت اللہ شہاب اور غیر آئی۔ سی۔ ایس افسروں میں تین جنھیں اضافی بھرتی کے نتیجے میں سرکاری ملازمت ملی تھی۔ ان تین افسروں کے نام عالی نے بوجوہ ظاہر نہیں کئے لیکن ان مین سے دونے جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن سے تعلیم حاصل کی تھی جہاں اردو میں تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ جی احمد صاحب نے جن چار افسروں کی انگریزی کی صلاحیت کی تعریف کی ان میں سے تین کا تعلق سرکاری برطانیہ کے زیر تسلط صوبوں سے نہیں بلکہ "دیسی ریاستوں" سے تھا، دو کا حیدر آباد سے اور ایک کا کشمیر سے۔ اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ یہی نا کہ جہاں انگریزی ذریعہ تعلیم نہیں تھی وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو انگریزی پر عبور حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور دیسی ریاستیں برطانوی صوبوں پر جہاں انگریزی کا سکہ چلتا تھا، فوقیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔

اس کے علاوہ اپنے معاصرین کا تذکرہ کرتے ہوئے عالی صاحب نے لکھا ہے کہ جناب نورالحسن جعفری، جناب مختار مسعود، جناب آفتاب احمد خان سمیت بہت سے اعلی افسران

کا انگریزی اظہار معروف رہا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان تینوں کا اردو ادب اور ادبی انجمنوں سے تعلق ہے' اس کے معنی یہ ہوئے کہ اپنی زبان اور ادب سے تعلق کے بغیر کوئی کسی دوسری زبان میں دستگاہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس نتیجے کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جو لوگ ہمارے دفاتر میں انگریزی کے محافظ بنے بیٹھے ہیں' اور جنہوں نے اردو کی راہ مسدود کی ہوئی ہے' وہ خود اس زبان کے موثر استعمال پر کوئی قدرت نہیں رکھتے۔ جب صورتحال یہ ہو تو عالمی سطح پر پاکستان کے موقف کی خاطر خواہ نمائندگی کیسے ہو سکتی ہے جہاں انگریزی ہی اظہار خیال کی زبان بن گئی ہے۔ اب ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ سرکاری سطح پر انگریزی زبان کے محافظ اپنی بضاعتی کے سبب قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ عالی نے مختلف علمی تصانیف کے علاوہ ان دونوں کتابوں پر سیر حاصل مقدمے لکھے ہیں اور بہت صفائی اور بے باکی سے اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہے۔

عالی کی شخصیت میں ایک عجب تضاد کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ جتنے وہ اپنی انا کے پرستار دکھائی دیتے ہیں اتنے ہی کو وہ اپنے بزرگوں' عزیزوں اور دوستوں کی محبت کے اسیر نظر آتے ہیں۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے وہ اپنے کالم میں کسی رخصت ہونے والے کا نوحہ لکھتے ہیں۔ "یاد رفتگاں" کے عنوان سے ان کے اظہاریوں کی ایک جلد تیار ہو سکتی ہے۔ جانے والوں میں بعض تو انہیں اتنے عزیز تھے کہ ان کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے اکثر ان کے کالموں میں آتا رہتا ہے۔ ممتاز حسن صاحب' پیر حسام الدین راشدی' ابن انشاء' سلیم احمد یہ چند نام تو ایسے ہیں جو ان کی یادوں میں رچ بس گئے ہیں۔ ان کا ذکر وہ برابر کرتے رہتے ہیں۔ اپنی اس محبت اور وابستگی کے اظہار میں انہوں نے چند خاکے لکھے ہیں جو جانے والوں سے ان کی خصوصی روابط کی خوبصورت عکاسی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے بہتر وہ خاکہ ہے جو انہوں نے اپنے رشتے کے چچا سراج الدین خاں سائل کی یاد میں لکھا ہے' اس خاکے میں سب کچھ ہے' عالی کی بچپن سے ابھرتی ہوئی انا' جذبہ بغاوت' مٹتی ہوئی قدروں کی تکریم' گزرے ہوئے زمانے کا ماحول' ایک یادگار ہستی کی دلکش تصویر' اس کے بے ضرر اشغال' اس کی مرنجان مرنج شخصیت اور اس کے اٹھ جانے پر اپنے بیگانے سب کا شدید غم خاص طور پر بیخود دہلوی جیسے ترش مزاج اور تلخ کلام مخالف کا۔ اب اس خاکے کی کچھ جھلکیاں دیکھئے۔

جمیل الدین عالی نے جب تیرہ سال کی عمر میں سائل جیسے استاد کی اصلاح کو ماننے سے یہ کہہ کر انکار کردیا۔ "ہم زبان وبان نہیں مانتے چچا جان" اور اس پر ان کی چچی داغ کی بیٹی لاڈلی بیگم نے ان کا حوصلہ بڑھایا تو بجائے ناراض ہونے کے سائل صاحب مسکرائے "انہوں نے عینک اتار کر رکھ دی اور نیم دراز ہوگئے"۔

"بیگم یہ مٹھائی اٹھوالو۔ گھر ہی میں بٹے گی۔ جمیل میاں ہمارے شاگرد نہیں ہوں گے۔ انہیں زبان سے کوئی علاقہ نہیں ہمیں اور کچھ آتا نہیں"۔

عالی نے شاگرد ہونے پر اصرار کیا' سائل صاحب راضی نہ ہوئے تو انہوں نے دھمکی دی کہ ہم استاد بیخود کے پاس جارہے ہیں اور پھر استاد بیخود سے ڈر کے یہ فرمائش کی کہ پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کے نام رقعہ لکھئے کہ ہم ان سے فارسی پڑھیں گے وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ عینک صاف کرکے آنکھ پہ لگائی اور رقعہ لکھ دیا۔

کیا عجب حلم تھا سائل صاحب کی طبیعت میں۔

ایک دفعہ جمیل الدین عالی کے والد نے جو والی لوہارو تھے دہلی میں دربار میں شرکت سے واپسی پر اپنے چچازاد بھائی اور سالے سائل صاحب سے یہ کہہ دیا "سراج الدین خان' کپڑے قیمت سے نہیں بنتے' سلائی بھی اچھی ہونی ضروری ہے"۔

یہ بات ایسی دل کو لگی کہ رینکن کا آدمی بلا کر چار گھنٹے روز محنت کرکے کپڑے قطع کرنا اور سینا سیکھ لیا اور پھر وہ مہارت حاصل کی کہ نواب لوہارو ان سے اپنے فراک کوٹ اور ڈنر سوٹ قطع کراتے تھے۔

"کیا مجال جو کسی کی قینچی ان کے کپڑوں کو لگ جائے' تراش ٹیڑھی ہوجائے یا سلائی موٹی ہو تو سائل دہلوی کو لوگ کیا کہیں گے... عزیزوں' دوستوں اور شاگردوں کے لئے تحفے بھی اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے بھیجتے تھے' کسی کو کڑھا ہوا رومال کسی کو اپنے ہاتھ کے قط لگے ہوئے قلم"۔

ذرا ان کے قط لگانے کا ذکر سنئے۔ "اب ایک دن مقرر ہوتا اور شاگردوں اور شوقینوں اور مداحوں میں دھوم مچ جاتی کہ آج نواب سائل قلموں پہ قط لگائیں گے۔ اب مقررہ دن کو لوگ حلقہ باندھے بیٹھے ہیں۔ عطریات سے تواضع ہورہی ہے۔ اور چچا جان ہاتھی دانت سے مزین چاقو لئے چاندی کی ہتوڑی اور چھوٹی سی تپائی سامنے رکھے قط لگارہے

ہیں... قلموں پر قط لگانے میں ایسی ہی احتیاط برتتے تھے جیسی زبان کے معاملے میں۔ زبان انہیں بہت عزیز تھی۔"

ایک دفعہ شام کو عید کا سلام کرنے کے لئے ایک شہدہ (بھانڈ) آیا، روشنی کم تھی سائل صاحب کو خیال ہوا کہ حکیم اجمل خان آئے ہیں، وہ تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسے پہچانا تو اسے بٹھا کے بیٹھ گئے۔ وہ دعائیں دیتا ہوا رخصت ہو گیا۔ اس غلط فہمی کو اس طرح نبھایا کہ چالیس سال تک جب وہ آتا تو نواب سائل تعظیم کے لئے اٹھ جاتے۔ جب عالی کے سامنے ایسا ہوا تو انہوں نے سخت احتجاج کیا۔ تب یہ راز کھلا کہ اس تعظیم کے پیچھے کیا غلط فہمی کارفرما تھی۔ یہ وضعداری اور پاس خاطر کی انتہا تھی۔

سائل صاحب کے جنازے میں ان کی مدت العمر کے حریف استاد بیخود صاحب بھی لائے گئے ان کے پرستار کنور مہند سنگھ سحر بہت مغموم تھے۔ تدفین کے بعد ایک نوجوان نے انہیں سائل صاحب کا ایک سفارشی رقعہ دیا۔ "حامل رقعہ ہذا میرے محلے کا بچہ ہے... اس سے مجھے مہر مفرط ہے۔ آپ اس کے لئے روزگار کی سبیل مہیا کریں گے تو سائل ممنون ہوگا"۔

اس رقعے پر سب نے شک کیا۔ عالی نے کہا انہوں نے نہیں لکھا۔ کسی نے کہا "جھوٹا ہے" یہ سن کر استاد بیخود گرجے "سچا ہے حرام زادو، سچا ہے یہ سراج الدین ہی کا خط ہے" جب کنور مہندر سنگھ نے پوچھا "وہ کیسے استاد" بیخود صاحب بولے "ہائے اب یہ بھی بتادوں۔ ارے دلی میں اب کون رہ گیا ہے جو مہر مفرط کی ترکیب یوں روانی سے استعمال کر جائے" سائل نے جاتے جاتے اپنے دشمن سے بھی خراج لے لیا۔

عالی نے ذرا بڑے ہو کر جب ایک بار سائل صاحب سے درخواست کی کہ انہیں اپنا شاگرد بنالیں تو انہوں نے بہت نرمی سے جواب دیا تھا "نا بیٹا نا، ہمیں زبان سے لگاؤ ہے اور تمہیں، تمہیں شاید کسی چیز سے بھی لگاؤ نہیں ہے" عالی کو کسی چیز سے لگاؤ ہو یا نہ ہو لیکن یہ خاکہ لکھ کر انہوں نے یہ ضرور ثابت کر دیا کہ سراج الدین خان سائل سے انہیں بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ یہ تحریر ایک شاہکار خاکہ ہونے کے ساتھ عالی کی بیڈھب شخصیت پر ایک بھرپور اظہاریہ بھی ہے۔

عالی کی تحریروں کے جائزے کے بعد اب ہم موضوع کتاب سے صاحب کتاب کی

طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ عبدالعزیز ساحر ان کے خاکوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”عالی کے ہاں خود پرستی کا عمل اس مقام کی طرف ارتقاء پذیر ہے جہاں انکسار ذات کا صوفیانہ عمل امکانی رابطے کو فکری زاویئے کی مکالماتی توجیہ بنادیتا ہے۔ کسی بھی شخصیت کی معنوی تلاش تخلیقی لمحوں کی منت آشنائی کے مترادف ہے کیونکہ جس طرح خیال کی تجسیم نگاری لفظوں کے لمحاتی گداز سے منکشف ہوتی ہے اسی طرح چہرہ نمائی کا عمل باطن کی غواصی سے سامنے آتا ہے“ اس مختصر سے اقتباس سے آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ ساحر کا انداز بیان عالی سے کس قدر مختلف ہے دونوں میں وجودیت اور وحدۃ الوجود کا بعد ہے۔ ساحر کی تحریر پر حضرت ابن عربی کی فصوص الحکم اور نکات بیدل کا پرتو نظر آتا ہے۔ عالی کی نثر سادہ اور رواں ہے جیسی اظہاریوں کی ہونی چاہئے لیکن کہیں کہیں اس میں رنگینی اور پرکاری نظر آتی ہے اور شاید یہ اثر ہے ان کی شریک حیات اور میری پھوپی زاد بہن طیبہ بانو کی زبان دانی کا جولوہارو اور دلی کی بامحاورہ گفتگو میں طاق ہیں اس کے برعکس ساحر کے لہجے میں ایک ماورائیت جھلکتی ہے' اور معانی کی گرہیں پردہ بہ پردہ تو بہ تو کھلتی ہیں۔ انداز نظر اور طبائع کے اس اختلا کے باوجود ساحر نے بڑی دیانتداری سے عالی کے نثری سرمائے کے ہر پہلو کو اجاگر کیا ہے اور ان کی شخصیت کے خدوخال کو نمایاں کرنے کے لئے ان کے دوستوں اور ناقدوں کی آراء کو ”بہ چہ نامت خوانم“ کے عنوان سے مرتب کردیا ہے۔

عبدالعزیز ساحر کی اس کتاب کے مطالعے سے قاری پر یہ ضرور واضح ہوجائے گا کہ شعر و سخن کی پراسرار وادیوں میں بسنے والے بھی بعض اوقات اس آب و گل کی دنیا میں کارزار حیات کے سپوتوں کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی روشن ہوجائے گا کہ غالب کی طرح مسائل تصوف کے بیان سے وابستگی رکھنے والے ان کے کارناموں کو پرکھنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

شاعر ہونے کے باوجود عالی نے ادب سے بینکاری تک کے لئے منصوبے بنانے' اہم معرکے سر کئے اور ساتھ ہی اپنی کامیابی' نامرادی اور تمناؤں کی داستانیں رقم کیں۔ اس طرح ان کی نثر کا پھیلاؤ ان کی نظم سے کہیں بڑھ گیا۔ اپنے فطری ذوق تصوف کے باعث ساحر کو ان حقائق تک رسائی حاصل کرنے کی لگن ہے جو پرے سے بھی پرے ہیں' لیکن ماورایت کے اس رجحان نے انہیں تحقیق کی سنگلاخ زمین پر قدم اٹھانے سے باز نہیں

رکھا۔ انہوں نے اخبار کے انباروں کو کھنگالا' حالی کی تمام تصنیفات کا بغور مطالعہ کیا' متعلقہ کتابوں سے حوالے تلاش کئے اور بڑی محنت سے اپنے تحقیقی مقالے کو پورا کیا۔ تحقیق کرنے والے کی شخصیت اور اس ہستی میں جو اس کتاب کا موضوع ہے بعد المشرقین ہے۔ ساحر اور حالی کے درمیان مشکل ہی سے کوئی قدر مشترک نظر آئے گی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں' مزاج میں' مشرب میں اور انداز نظر میں۔ لیکن ساحر نے اس مغایرت کو اپنی راہ میں حائل ہونے نہیں دیا۔ انہوں نے بڑی محنت سے حالی کی نثر کے مواد کو اکٹھا کیا' بڑی کاوش سے اس کا مطالعہ کیا' بڑی خوبی سے اس کا جائزہ لیا اور اس شائستگی سے اس کو پرکھا کہ تنقید کو تقریظ بنا دیا۔ یہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔

افتخار احمد عدنی

حرفِ چند

پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

جمیل الدین عالی کی شخصیت میں ایک خاص موہنی ہے اور دل آویزی اور دل ربائی کے وہ سب، رنگ اور رس بھی جنہیں مُمکی، مہک اور چاندنی کی طرح محسوس کیا جا سکتا ہے، جن کے خواب دیکھے جاتے ہیں لیکن بہت سی صورتوں میں جنہیں کوئی نام نہیں دیا جا سکتا----- اور اس آہنگ اور شیوے کے لوگ معاشرے میں کبھی بہت عام نہیں رہے:

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے دیکھے نہ ہوں گے، ہاں مگر، ایسے بھی ہیں!

عالی ایسے ہی ہیں----- اپنی ذات میں نادر، بہت بھرپور، ہمہ جہت اور زندگی سے معمور

☆

اپنی انرجی اور سخت جانی پر کبھی، کیا کیا گمان اور مان نہ تھے، لیکن یہ جب کی بات ہے کہ عالی کو سرگرم کار نہ دیکھا تھا! واقعہ یہ ہے کہ ان تھک کام کرنے اور نشست اٹھانے، زندگی کرنے اور نبھانے میں وہ بے مثال ہیں۔ پھر، اس توانائی اور طراری کے ساتھ، ان کی سی قوت اظہار، کیا تحریری کیا خطابی اور کیا اردو، کیا انگریزی ان کے ہم عمروں اور ہم عصروں میں ناپید ہے--- وہ اپنی اثباتیت اور قومی عصبیت یا پاکستانیت، اپنی دردمندی اور تجزیہ پسندی اور اپنی دوربینی اور درویشی اور اپنی دانش وری اور دانش جوئی کے اعتبار سے بھی ہمارے لئے فخر، رشک اور تکریم کا حوالہ ہیں۔

☆

خوشی کی بات ہے کہ عبدالعزیز ساحر نے جو ذہنی تربیت کے اعتبار سے صوفیانہ روایت

کے نوجوان ہیں، جمیل الدین عالی کی نثر کو موضوع گفتگو بنایا۔ انہیں وقت بہت کم ملا۔۔۔(۱) پھر بڑی شخصیت کی مشکل یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک کوشش اور ایک جست میں اس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہوتا، ہوسکتا بھی نہیں۔ بایں ہمہ میرے لئے طمانیت اور راحت کی بات یہ ہے کہ ایک بڑے کام کا اچھا آغاز ہوا اور جمیل الدین عالی کے فکری سفر کا ایک طالب علمانہ جائزہ پیش کرنا ممکن ہو سکا۔

☆

عالی صاحب نے ایک موقع پر اپنے مخصوص اسلوب میں لکھا ہے کہ:

"۔۔۔۔۔۔ مجھ میں پرانے مشاعروں کے شاعروں کے کئی عیوب موجود ہیں۔ اپنی یا کسی کی بھی نازیبا ہوٹنگ ہو تو موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ داد کم ملے تو دل بجھ جاتا ہے۔۔۔ ہم پرانے آدمی ہیں، تعریف چاہے زیادہ نہ کرو مصرعہ تو اٹھاؤ۔۔۔۔۔۔" (جنگ کراچی، ۱۲جون ۱۹۸۱ء)

امید ہے کہ مقالہ نگار نے جس طور مصرعہ اٹھایا ہے، اس سے نہ صرف یہ کہ عالی کا موڈ خراب نہیں ہوگا بلکہ انہیں (اور ان عام اور بے حد و بے شمار انسانوں کو بھی، جن کے حصول مسرت کے لئے لکھنا، عالی صاحب نے اپنا ہدف ٹھہرایا اور مقصد بنایا ہے) "اکساوا" اور "بڑھاوا" ملے گا۔۔۔۔۔۔ جو فکری اور تخلیقی سطح پر کسی کام کرنے والے کے لئے ایک ٹانک اور نعمت سے کم نہیں!

آنکھ اوجھل ہونے پر "مجاور" بن بیٹھنے میں بھی کوئی حسن ضرور ہوگا، لیکن بروقت، اعتراف کمال بجائے خود ایک نیکی ہے۔۔۔۔ اور اپنے درمیان ہوتے، بڑوں کو پہچاننے اور ماننے میں اصل بڑائی ہے۔۔۔۔۔ اس خوش توفیقی پر مقالہ نگار کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔۔۔۔

☆

عالی کی معروف معنوں میں کوئی "لابی" نہیں (اگرچہ وہ معاشرے کے پسے اور پچھڑے ہوئے اپنے لاکھوں قارئین کے دلوں میں مستقلاً بستے اور ان کی دعا ہائے نیم شبی میں رہتے ہیں) آدمی واقعتاً بڑا ہو تو "لابی" یا "پی آر" کے پھیر میں وہ کچھ زیادہ پڑتا بھی نہیں۔۔۔۔۔۔ "واقعی بڑا آدمی" ماضی کبھی نہیں بنتا، وہ حال رہتا ہے، وہ مستقبل رہتا ہے اور مستقل رہتا ہے۔۔۔۔۔۔

جمیل الدین عالی' ایک ایسے ہی مغتنم زمانہ اور نادر الوجود آدمی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنی شخصیت کی خلاقی اور تابانی اور اپنے عالی رتبہ کاموں اور کارناموں کی بنا پر' ان کی خدمات اور ان کے اثرات کا جائزہ بڑے پیمانے پر بھی لیا جائے گا اور لیا جاتا رہے گا..... اور ایسے کسی موقع پر اپنے تمام محدودات کے باوجود زیر نظر کام' کسی نہ کسی درجے میں راہ پیما کا کام دے تو میں سمجھوں گا کہ ہمارے ہاں شعبہ اردو میں کی گئی یہ کوشش بار آور ہوئی۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
پروفیسر و صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج' لاہور

عرض تمنا

(۱)

انسانی زندگی کا عمل خارج سے باطن اور باطن سے خارج کی طرف مسلسل حرکت میں رہتا ہے۔ اس سے عرفان ذات سے انکسار ذات تک کا معنوی منظر نامہ اپنے لمحاتی احساس سے تخلیقی تجربے کا جواز بن جاتا ہے۔ حسی امکانات کی جلوہ نمائی دراصل اپنے وجود کی ہمہ گیری کو جدلیاتی وحدت میں سمیٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے فکری سلسلے کا روایتی پس منظر اپنے عصری کینوس پر جذباتی عوامل سے مل جاتا ہے جہاں اس عمل سے تہذیبی شعور میں معنی کی تلاش بازیافت سے نکھرتی ہے وہیں دنیائے معنی کی تہہ داری نئی صورت سے آشنا ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا طرزِ احساس ہے جس سے اجتماعی رویے ایک نئے زاویہ نگاہ سے مملو ہوتے ہیں۔ لہجے میں نشاط انگیز جھلک بدلتے ہوئے رجحانات میں انائے ذات کی اس پر اعتمادی کا نتیجہ ہے جو امید و بیم کے ملے جلے تاثر سے پھوٹتی ہے۔ اس سے حرف آشنائی کا عمل داخل کی ان گہرائیوں کا عکاس بن جاتا ہے جو وقت کی معنوی اکائی کا اشاریہ قرار پاتی ہیں۔

(۲)

میں بھی وقت کی اکائی کے اس شعوری عمل کا ایک حصہ ہوں جو پھیلتے ہوئے سویروں میں خوب سے خوب تر کی تلاش کا وجدانی رابطہ ہے۔ اس کیفیت کا عرفان مجھے اس وقت ہوا جب ایم۔اے اردو کے پہلے سال میں کامیابی پر میرا صدیوں کا سفر تھکن اتارنے کے لئے لمحہ بھر کو رکا ------ میں نے اپنے اندر جھانکا تو موسموں کے ان رنگوں کو سینہ جاں پر اترتے دیکھا جو گلاب رتوں کی تازگی کا لازمہ ہوتے ہیں۔ خارج میں نگاہ اٹھائی تو تلاش و جستجو کے ایک نئے زاویے کا عکس پڑ رہا تھا ------ جمیل الدین عالی

(۳)

جمیل الدین عالی کی نثر زندگی کی قدروں کا ایسا بیانیہ ہے جو شاعری میں دھنک رنگ فضا کے منظر بناتا ہوا کائناتی تناظر میں پھیل جاتا ہے۔ ان کے خیال و فکر کی رنگارنگی کا یہ عالم ہے کہ قوس و قزح کی رنگینی احساس کے وجدانی جذبے کا تصویری خاکہ بن رہی ہے۔ جب عرفان ذات کی معنوی بصیرت لمحوں کے امکانی تجربے سے اظہار کی راہ پاتی ہے تو بے نام مسافتوں کی لذت آشنائی جذباتی تموج کے پس منظر سے چہرہ نمائی کا احساس دلا دیتی ہے۔ اس طرح جب لہجے کی بلند آہنگی مدھر سروں کی لے کاری سے حظ اٹھاتی ہے تو ماحول کے سکوت میں ارتعاش کا عنصر زندگی کا وجود نامہ ترتیب دے دیتا ہے ------ زندگی کا یہی احساس مجھے عالی کو پڑھتے ہوئے بار بار ہوا۔

(۴)

میں نے فکر عالی کے سلسلے میں اپنے مطالعاتی افادات کو حسبِ ذیل صورت دی ہے:

۱۔ جمیل الدین عالی : سوانحی خاکہ
۲۔ شخصیت : توائے مجموعۂ خوبی بہ چہ نامت خوانم
۳۔ عالی کی سفرنامہ نگاری : فکری اور فنی جائزہ
۴۔ عالی اور اظہاریہ نگاری کی روایت
۵۔ عالی کی شخصیت نگاری ------ ایک مطالعہ
۶۔ عالی بحیثیت مقدمہ نگار
۷۔ نثرنگاری کی دوسری جہتیں اور عالی
۸۔ عالی کا فکروفن ------ ایک نگہ بازگشت

ان ابواب میں عالی کی نثرنگاری کی (تمام) ممکنہ ,وں ہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ حتی الوسع سعی کی گئی ہے کہ ان کی شناخت اپنے تمام تر فکری پس منظر کے ساتھ اجاگر ہو۔ مقالے کے آخر میں ایک ضمیمہ بھی دیا گیا ہے۔

یہ ضمیمہ ۱۹۸۱ء تا ۱۹۹۱ء گیارہ سالہ اظہاریوں کے اشاریے پر مبنی ہے۔ اشاریے کی یہ ترتیب زمانی ہے۔ یہ اظہاریے ابھی تک غیرمدون صورت میں ہیں۔ فہرست سازی کا یہ کام روزنامہ جنگ کے لاہور ایڈیشن سے ترتیب دیا ہے۔ جنگ کے ریکارڈ روم تک رسائی عابد تہامی اور شاہد الرحمٰن ہمایوں کے توسط سے ممکن ہوئی ہے۔ میں ہر دو دوستوں کا ممنون ہوں کہ

انہوں نے میرے کام میں دلچسپی لی اور تعاون کیا۔

(۵)

جادۂ حیات پر چلتے ہوئے مشکل مرحلوں میں ایک ہستی نے ہمیشہ انگلی پکڑ کر روشنی کی سمت راہنمائی کی ------ زندگی کے کرب ناک لمحوں میں زندہ رہنے کا شعور بخشا ------ میں نے جب بھی قلم اٹھایا انہوں نے آگہی کے سپنوں کو تعبیر کے قرینوں میں ڈھالنے کا حوصلہ دیا اور اگر کبھی میں تحیر کے دھندلکوں میں کھو گیا تو انہوں نے نور سحر میں اجال دیا ------ ایک شخص ------ ایک استاد ------ ایک دبستان ------ نذر صابری، شکریہ یا ------ مجھ جیسا بے مایہ شخص ان کے چرنوں میں کیا دان کرے؟

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے نگران کار سے بڑھ کر ایک شفیق باپ کا سا کردار ادا کیا۔ انہوں نے نہ صرف موضوع مقالہ کا انتخاب کیا بلکہ میرے کام کی ابتداء سے تکمیل تک خصوصی شفقت کا حصار کئے رکھا۔ کتابوں کی فراہمی سے لے کر ترتیب مقالہ تک انہوں نے ہر ممکن مدد کی۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد احسان الحق نے دست تعاون دراز رکھا۔ انہوں نے تو اپنی ذاتی لائبریری میرے حوالے کر دی۔ ان کا گھر میرے لئے گوشہ امان ہے۔

اک حسن اتفاق ہے بس اور کچھ نہیں
ذرہ بھی اک ستاروں کے جھرمٹ میں آ گیا

اپنے ان ہر دو اساتذہ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے خصوصی نظر عنایت سے میرے کام کی نگرانی کی۔ دوستوں میں ڈاکٹر اشفاق احمد، محمد شفیق اور مدثر گیلانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے پریشان کن لمحات میں میری ہمت بندھائی، گیلانی کا بطور خاص ممنون ہوں کہ اس نے کمرے میں پڑھائی کا ماحول بنائے رکھا۔ ورنہ مقالہ نویسی کے دوران زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

(۶)

جمیل الدین عالی کی نثر ان کی شاعری کی مانند احساس اور فکر کی تخلیقی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس میں زندہ رہنے اور آنے والی نسلوں کو متاثر کرنے کا عنصر بمقدار زائد موجود ہے۔ نقادوں کی ساری توجہ ان کی غزلوں اور دوہوں پر مبذول رہی اور نثر پر چند مضامین کے سوا کچھ نہ لکھا گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی نثر ------ شاعری سے پیچھے نہیں۔ اس مقالے میں ان کے نثری کام کو فکر و فن کے مجموعی تناظر میں جانچنے کی کوشش کی گئی ہے ------ یہ

ایک طالب علمانہ کاوش ہے۔ بہر حال اسے تفہیم عالی کا نقطۂ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔

۹۹۔ نیو ہوسٹل
گورنمنٹ کالج لاہور
عبدالعزیز ساحر

(۱)

خواب اور خیال کی معنوی فضا مراقبہ فکر کے اس لاشعوری تجربے سے تشکیل پاتی ہے جو تخلیق کے امکانی رابطے کا منظر نامہ ہے۔ احساس کی یہ صورت گری وجدان کے اس جذبے سے مستعار ہے جو شخصی زاویۂ نگاہ کو زندگی کی مختلف جہتوں میں محو سفر رکھتا ہے۔ خواب کی تجسیم کا یہ فکری پہلو رعنائی خیال کی اس ہمہ گیری کا مرہون منت ہے جو حقیقت کے معنوی دائرے کو وسعت سے آشنا کر دیتی ہے۔ جب اس عمل کی کارفرمائی گمان کو یقین کا روپ عطا کرتی ہے تو زندگی کی اقدار صداقت کا علامتی نشان بن کر وجود کی معنوی فضا کو پردۂ احساس کے شعوری رنگوں میں بکھیر دیتی ہیں۔ خیال و فکر کی یہ جمالیاتی تعبیر جب خارج میں وارد ہوتی ہے تو شخصی حوالے تجربے کو نئے ذائقوں سے آشنا کرتے ہیں۔ مجھ پر حقیقت کی یہ باطنی توجیہہ شیخ اکبرؒ کے مطالعے سے منکشف ہوئی۔ جن کے ہاں فکر کی مشاہداتی وحدت' مراقبہ خیال کے وجدانی کیف میں سمٹ آئی ہے۔ پردہ دل پر واجب الوجود کی جلوہ فرمائی کنت کنزا" **مخفیا**" کی وہ جمالیاتی اساس لئے ہوئے ہے جو ممکن الوجود کے سفر مراجعت کو آسان بنا دیتی ہے۔

جمیل الدین عالی کے نثری ذخیرے کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے صوفیائے کرام کے الہیاتی اور وجدانی افکار سے استفادہ کیا ہے۔ میرے لئے حد درجہ طمانیت کا باعث تو یہ ہے کہ مغرب زدگی کے اس عہد میں شیخ اکبرؒ کی فکر نے مجھے نئے مفاہیم عطا کئے ہیں۔ جو عرفان ذات کی معروضی تفسیر کا تنزیہی پہلو ہیں۔

(۲)

اس مقالے کو کتابی صورت دیتے وقت' میں بعض مقامات پر تبدیلی اور اضافے کا خواہاں تھا۔ لیکن محشر خیال کی انجمن آرائی نے اس جانب توجہ کی فرصت نہ دی۔ لہٰذا اس مقالے کو اسی صورت میں چھاپ رہا ہوں۔ جس طرح یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔ کتاب کی اشاعت ایک ایسے صوفی منش کے حصہ میں آئی جو آیۂ جمال کے نقش گر کا ہم جلیس رہا۔ میں اسے بھی شیخ

اکبرؒ کا باطنی تصرف خیال کرتا ہوں۔ کیوں کہ ----

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

محمد نگر، اٹک

عبدالعزیز ساحر

جمیل الدین عالی
سوانحی خاکہ

نام: مرزا جمیل الدین احمد خان
(جمیل الدین عالی : راقم مقالہ سے گفتگو، ۲۹۔نومبر ۱۹۹۱ء بمقام حبیب بنک پلازا، کراچی)

تخلص : عالی
"(سائل دھلوی) سے متاثر ہو کر جمیل الدین عالی نے پہلے اپنا تخلص مائل رکھا۔ مگر چچا ضمیرالدین خان نے عالی سے کہا کہ دادا کا تخلص رکھو، دادا علاؤالدین خان علائی کے لئے غالب نے تین تخلص تجویز کئے تھے۔ علائی، عالی، نسیمی۔ دادا کے چھوڑے ہوئے تخلصوں میں سے جمیل الدین مائل نے اپنے لئے عالی تخلص چن لیا۔" (انتظار حسین ----- ملاقاتیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۶۶)

قلمی نام : جمیل الدین عالی
عالی کی تمام کتابوں اور تحریروں پر یہی بطور قلمی نام مندرج ہے۔

جائے ولادت : دہلی
"میں کھرا دلی والا ہوں، وہیں پیدا ہوا، وہیں پروان چڑھا"
(دنیا مرے آگے، جمیل الدین عالی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۴۴)
"میں دلی میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا"
(جمیل الدین عالی : نثار ناسک اور پروین سید سے بات چیت، مشمولہ جمیل الدین عالی، ----- فن اور شخصیت، ص ۳۵۶)

تاریخ پیدائش : ۲۰۔ جنوری ۱۹۲۶ء

اِدھر اُدھر مختلف جگہوں پر ان کا سالِ ولادت ۱۹۲۶ء اور تاریخ یکم جنوری یا ۲۵۔ جنوری چھپی ہے۔ لیکن یہ دونوں تاریخیں صحیح نہیں ہیں۔ عرشی زادہ نے عالی کے نام اپنے ایک خط میں ان کی تاریخ پیدائش ۲۰۔ جنوری ۱۹۲۶ء لکھی ہے جو ان کے والد کی بیاض سے نقل کی گئی ہے اور بیاض کتب خانۂ رامپور کے لوہارو سیکشن میں محفوظ ہے۔ (جمیل الدین عالی: راقم الحروف سے گفتگو، ۲۹۔ نومبر ۱۹۹۱ء، حبیب بینک پلازا، کراچی)

آبائی وطن : لوہارو

"دلی کے قریب چھوٹی سی ریاست تھی لوہارو، جو پہلے متحدہ پنجاب اور اب بھارت کے صوبہ ہریانہ میں شامل ہے۔ میرا تعلق اسی ریاست سے ہے۔" (جمیل الدین عالی: رفیق ڈوگر سے ملاقات، ماہنامہ دید شنید، لاہور، مئی ۱۹۹۰ء، ص ۱۹)

والد گرامی : نواب سر امیر الدین احمد خان المعروف فرخ میرزا

فارسی میں شعر کہتے تھے، (تخلص فرخی) ان کے ۶۴ یا ۶۷ روزنامچے کتب خانۂ رامپور میں موجود ہیں۔ مرزا غالب کا ایک خط بھی ان کے نام محفوظ ہے۔ جنوری ۱۹۳۷ء میں وفات پائی۔

دادا : نواب علاؤ الدین احمد خان علائی

"علائی ۲۵۔ اپریل ۱۸۳۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ------ تعلیم مرزا غالب کی نگرانی میں پائی ------ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے ------ غالب کے بہت چہیتے شاگرد تھے ------ ۳۱۔ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو وفات پائی۔ (خاندانِ لوہارو کے شعراء، حمیدہ سلطان احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دلی، ۱۹۸۱ء، ص ۸۱۔ ۸۲)

پڑدادا : نواب امین الدین احمد خان

لوہارو کے پہلے والی ہیں۔ ان کے والد نواب احمد بخش خان تو والئی جھرگا فیروز پور لوہارو تھے۔ وفات ۳۱ دسمبر ۱۸۳۶ء کی نصف شب کو

ہوئی۔
(خاندان لوہارو کے شعراء، ص ۸۱)

ددھیالی مشاہیر : نواب الٰہی بخش خان معروف، نواب ضیاء الدین احمد خان نیورخشاں، مرزا اسد اللہ خان غالب، نواب علاؤ الدین احمد خان علائی، مرزا زین العابدین خان عارف، مرزا باقر علی خان کامل، مرزا سعید الدین احمد خان طالب، نواب سر امیر الدین خان فرخی (والد)، ضمیر الدین خاں عالی (چچا)، مرزا بشیر الدین، شہاب الدین احمد خان ثاقب، نواب سراج الدین احمد خان سائل، مرزا شمس الدین خان شمس، مرزا صمصام الدین فیروز، نواب اعز الدین خان اعظم، مرزا اعتزاز الدین ہمایوں، نواب امین الدین خان (ثانی) امین، مرزا اصلاح الدین خان محشر، مرزا اعتماد الدین شاجہاں، مرزا ظہیر الدین بابر

والدہ : سیدہ جمیلہ بیگم

نانا : سید ناصر وحید بن سید ناصر وزیر سجادہ نشین خواجہ میردرد

ماموں : سید ناصر مجید
سید ناصر نواب

ننھیالی مشاہیر : خواجہ محمد ناصر عندلیب
خواجہ میردرد دہلوی (لاولد)
خواجہ میر اثر دہلوی صاحب مثنوی "خواب و خیال" (یہ خواجہ میردرد کے چھوٹے بھائی اور سجادہ نشین تھے۔ عالی صاحب کی والدہ ان کی نگڑ پوتی ہیں)

خاندانی رسم و رواج:
"ان نسبتوں اور دلی کے قیام نے ہمارے ہاں ایک بن کہا قانون رائج کر رکھا تھا، اگر ہم آسودہ حال ہوں تو حرف شناسی کے ساتھ، شطرنج، شعر، شہ سواری، پتنگ بازی اور تصوف سے شغف رکھیں۔"
(میں اور میرا فن : جمیل الدین عالی، شعور، شمارہ ۳، ۴۔ حیدر آباد،

ص ۱۸)

عالی کے مشاغل :

"(اگرچہ) مجھے میرے حالات یا مزاج کی محدودات نے صرف شعر اور لڑکپن میں سواری کی اجازت دی۔ باقی فنون سے دلچسپی ضرور رہی مگر مہارت حاصل نہ ہو سکی۔"
(جمیل الدین عالی : شعور، حیدر آباد، ص ۱۸)

تعلیم :

پرائمری تک تعلیم گھر پر ہوئی۔
میٹرک کا امتحان ۱۹۴۰ء میں اینگلو عریبک ہائی سکول دریا گنج دہلی سے پاس کیا۔
انٹر : اکنامکس، ہسٹری، فارسی اور انگریزی کے ساتھ اینگلو عریبک کالج (۲) اجمیری گیٹ دہلی سے کیا۔
بی-اے کا امتحان ۱۹۴۵ء میں پاس کیا۔ ان کے مضامین اکنامکس، ہسٹری، فارسی تھے۔
۱۹۴۵ء میں دلی یونیورسٹی میں ایم-اے اکنامکس میں داخلہ لیا۔ لیکن بوجوہ نامکمل چھوڑ دیا۔
عالی نے ۱۹۵۱ء میں سی-ایس-ایس کا امتحان پاس کیا اور پاکستان ٹیکسیشن سروس کے لیے نامزد ہوئے۔

قانون کی تعلیم :

۱۹۷۱ء میں جامعہ کراچی سے ایف-ای-ایل کیا۔
۱۹۷۶ء میں جامعہ کراچی سے ایل ایل بی سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔
ایل ایل بی کے بعد انھوں نے ایل ایل ایم میں داخلہ لیا۔ عالی نے خود ہی اردو کالج آف آرٹس میں ایل ایل ایم کلاسوں کا اجراء کروایا تھا۔ لیکن ایک بار پھر وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کرپائے۔(انٹرویو: ۳۰۔ نومبر ۱۹۹۱ء، حبیب بینک پلازا، کراچی)

شاعری کا آغاز :

"مجھے یہ تو صحیح یاد نہیں کہ میں نے پہلا شعر کب کہا لیکن ساتویں یا آٹھویں جماعت میں کہا ہوگا۔ لیکن پہلی پوری غزل مصرع طرح پر کہی ------ میرے بڑے بھائی مرزا اعتزاز الدین مرحوم جہلم میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ وہ سوہاوہ کے ڈاک بنگلے میں رہا کرتے تھے۔ ہم چھٹیوں میں اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اچھا میں ایک مصرعہ دیتا ہوں تم شام تک غزل کہنا اور اس طرح (۱۹۳۹ء) میں، میں نے باقاعدہ سات شعر کی غزل کہی" --

(ہم کلامیاں --- حسن رضوی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۰۴)

نثر کا آغاز :

"میں نے نثر لکھنی زمانہ طالب علمی میں شروع کی۔ سب سے پہلی نثری چیز "کافی ہاؤس میں" کے عنوان سے کالج میگزین "کارواں" ۱۹۴۲۔۴۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ انشائیے کی طرز کی تحریر تھی۔"

(جمیل الدین عالی : راقم الحروف سے گفتگو، ۲۹۔ نومبر ۱۹۹۱ء، حبیب بینک پلازا، کراچی)

دلی کالج کے چند نامور طلبہ :

جمیل الدین حسن، ڈاکٹر جاوید وششٹ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جمیل الدین عالی، اختر الایمان، علی سردار جعفری، عباس احمد عباسی، انیس ہاشمی، عرفان امتیازی، ملک نسیم الظفر، (جسٹس) ظہور الحق، (جسٹس) نعیم الدین

(اینگلو عربک کالج دہلی : ڈاکٹر عبادت بریلوی، افکار، کراچی، شمارہ ۱۷۸، جنوری ۱۹۸۵ء)

اساتذہ: فارسی: پروفیسر منظور حسین موسوی
ڈاکٹر عبدالشکور احسن
(بعد میں جامعہ تہران اور جامعہ پنجاب)

انگریزی: پروفیسرلاری مر
پروفیسر عبدالصمد
پروفیسرامجد علی
تاریخ: پروفیسرخورشید احمد چشتی
پروفیسر آفتاب احمد
معاشیات: پروفیسر محمد لطیف قریشی

بیگم : طیبہ بانو بنت مرزا صمصام الدین فیروز
(طیبہ بانو کی والدہ نواب انور زمانی بنت نواب اسحاق خان بن نواب غلام مصطفیٰ خان شیفتہ)

شادی : ۳۰۔ ستمبر ۱۹۴۴ء

اولاد : حمیرا زوجہ احمد مصطفیٰ خان قصوری
ذوالقرنین جمیل عالی
مرزا نصیرالدین
حسان الدین جمالی (فوت شد)
ربیعہ شاداب زوجہ شاداب مسرت
مراد جمیل

ملازمت :

"(۱۹۴۶ء) میں مجھے بمبئی میں ریزرو بینک میں نوکری مل گئی لیکن اس وقت میری بیوی بیمار ہوگئی۔ اس لئے میں اسے چھوڑ کر آگیا وہ میں نے کی ہی نہیں" (انٹرویو : ماہنامہ دید شنید' لاہور' مئی ۱۹۹۰ء' ص ۱۹)
"۱۹۴۸ء میں فرسٹ او ٹی ایس (پاکستان کے پہلے فوجی افسران کے امتحان مقابلہ) میں کامیاب ہوا مگر میڈیکل میں رہ گیا۔"
(مقالہ نگار سے گفتگو' ۳۰۔ نومبر ۱۹۹۱ء' حبیب بینک پلازا' کراچی)
"(۱۹۴۸ء) میں حکومت پاکستان وزارت تجارت میں بطور اسسٹنٹ (ملازم) ہوگیا۔ (ماہنامہ دید شنید' ص ۲۰)
۱۹۵۱ء میں (سی۔ایس۔ایس کے امتحان میں کامیابی کے بعد)

پاکستان ٹیکسیشن سروس ملی اور انکم ٹیکس افسر مقرر ہوئے (فلیپ : حرفے چند)

"میں ستمبر ۱۹۵۹ء میں ایوان صدر گیا اور ۱۹۶۳ء تک رہا (اس عہدے کے لئے انتخاب ہوا تھا محکمہ انکم ٹیکس سے ڈیپوٹیشن پر لئے گئے تھے۔)

(ماہنامہ دید شنید' ص ۲۷)

"ایوانِ صدر میں ڈیپوٹیشن ایک سازش کے بعد ستمبر ۱۹۶۳ء میں ختم کردیا گیا تھا"۔

"(۱۹۶۳ء) کے بعد وزارت تعلیم میں کاپی رائٹ رجسٹرار مقرر ہوئے"۔ (فلیپ : حرفے چند)

"کاپی رائٹ کے قانون کے نفاذ کی خاطر اس دوران میں اقوامِ متحدہ کے ثقافتی ادارہ یونیسکو کا میں فیلو منتخب ہوگیا تھا۔ انہوں نے مجھے ایک سال ٹریننگ بھی دی تھی۔ ریڈنگ میٹریل پر کاپی رائٹ قوانین بک پروڈکشن وغیرہ کے موضوعات پر انہوں نے مجھے یورپی ممالک' امریکہ' جاپان اور برما میں تربیت دلائی تھی۔ پھر وہاں سے آکر میں نے ۱۹۶۲ء میں کاپی رائٹ کا آرڈیننس بنوایا' بک کونسل بنوائی۔"

(ماہنامہ دید شنید' ص ۲۰)

"مجھے دوبارہ وزارت تعلیم میں بھیج دیا گیا۔ وہاں میں افسر بکار خاص کاپی رائٹ بن کر گیا---- مگر جس دن میں (رجسٹرار کاپی رائٹ مقرر ہوکر) چارج لینے گیا اسی دن مجھے نیشنل پریس ٹرسٹ میں ڈیپوٹیشن پر (بطور سیکریٹری پریس ٹرسٹ) بھیج دیا گیا۔"

(ماہنامہ دید شنید' ص ۲۰)

"نیشنل پریس ٹرسٹ کے سیکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔"

(فلیپ' حرفے چند)

"اختر حسین صاحب نیشنل پریس ٹرسٹ کے صدر ہوگئے تھے۔ اس وقت تک مذکورہ ٹرسٹ ایک پرائیویٹ ادارہ تھا اور بظاہر اس میں سرکاری عمل دخل نہیں تھا---- لیکن میں چونکہ مستقل سرکاری

ملازم تھا۔ اس لئے میں نے کہا کہ میں تو اپنی نوکری نہیں چھوڑوں گا تو گورنمنٹ نے مجھے اجازت دے دی کہ میں وہاں ڈیپوٹیشن پر کام کرسکتا ہوں ---- چنانچہ میں نے وہاں کام کیا۔" (ماہنامہ دید شنید' ص ۲۰)

"۱۹۶۶ء میں لندن چلا گیا اور واپسی ۱۹۶۷ء میں ہوئی" (ماہنامہ خوبصورت' کراچی' ص ۲۵)

"۱۹۶۷ء میں نیشنل بینک آف پاکستان سے وابستہ ہوئے اور سینئر ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ کے عہدے تک پہنچے وہاں سے سینئر ایگزیکٹو بورڈ کے عہدے پر ترقی پاکر پاکستان بینکنگ کونسل میں پلاننگ اینڈ ڈیویلپمنٹ ایڈوائزر مقرر ہوئے"۔ (فلیپ' حرفے چند)

"۱۹۸۵ء میں ریٹائر ہونا تھا کہ ساٹھ کا ہو رہا تھا۔ دو برس کی توسیع ملی۔ پھر ایک برس کی توسیع ملی۔ ۳۱۔ دسمبر ۱۹۸۹ء کو ریٹائر ہو گیا"۔ (مکتوب عالی بنام راقم مقالہ' ۲۔ مارچ ۱۹۹۲ء)

سیر و سیاحت : "عالی بہت بڑے سیاح ہیں' یہ اپنے عہد کے مارکوپولو اور کولمبس ہیں بلکہ اس لحاظ سے ان سے بھی ممتاز کہ ان بندوں نے دنیا کے اتنے ممالک (اور بعض ممالک اتنی بار) نہیں دیکھے جتنے اور جتنی بار عالی نے دیکھے' پھر ان دونوں سیاحوں نے آئس لینڈ اور ہماری دلی کہاں دیکھی تھی' عالی نے نئی دلی بھی دیکھی اور پرانی دلی کے گلی کوچے کی سیر بھی کی ہے۔ (جمیل الدین عالی : فن اور شخصیت' ص ۲۹)

"عالی چین بھی گئے اور بار بار گئے۔ پہلی بار ۱۹۶۶ء میں' دوسری بار ۱۹۶۷ء میں اور تیسری بار ۱۹۸۳ء میں"۔ (جمیل الدین عالی : فن اور شخصیت' ص ۳۰)

"(عالی نے) کئی بار بیرونی سفر کیئے۔ کئی بار حجازِ مقدس کی زیارت کی۔ وہ مزید دو مرتبہ روس گئے۔ برما اور جاپان گئے۔ اور تین مرتبہ چین گئے' ہندوستان (۱۹۸۲ء سے) یورپ' امریکہ' کینیڈا بار بار جاتے ہی

رہتے ہیں۔ اتفاق کہ وہ آئس لینڈ بھی ہو آئے ہیں اور شاید وہ اردو کے
پہلے ادیب ہیں جس نے آئس لینڈ دیکھا (یا اس پر لکھا)
(مقدمہ' دنیا مرے آگے' ص ۱۲)
"(عالی) امریکہ ایک بار اور گئے تھے۔ ڈاکٹر ہنری کسنجر کے ساتھ
ہارورڈ انٹرنیشنل سیمینار میں کئی ہفتے شرکت کی۔ وہاں اہم بین الاقوامی
شخصیات سے گہرا رابطہ رہا۔ امریکہ کی اور ریاستیں دیکھیں۔ خاص
طور سے جنوبی ریاستوں میں رنگ و نسل کے جھگڑے اور ڈاکٹر مارٹن
لوتھر کنگ آنجہانی کی تحریکیں' صدر کینیڈی سے ملے۔ بڑے بڑے
ادیبوں اور فنکاروں سے ملاقاتیں رہیں۔ پھر ہوائی' جاپان اور مشرق
بعید دیکھا۔ کئی بار اور یورپ گئے' روس بھی دوسری بار گئے' قرطبہ اور
غرناطہ دیکھے اور عین ثقافتی انقلاب کے زمانے میں دو مرتبہ چین گئے
اور ہفتوں رہے' افریشائی ادیبوں کے اجتماعات میں موثر شرکت کی۔
چین کے بہت سے صوبے دیکھے' ویتنام کی سرحدوں کو چھوا"۔
(مقدمہ' دنیا مرے آگے' ص ۱۰)
"(عالی) کہیں روما کے کلوسیم میں گھوم رہے ہیں' کہیں سپین کے پل پر
پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں' کہیں ٹیمز میں جھانک رہے ہیں"۔(مقدمہ' دنیا
مرے آگے' ص ۱۵)
"۱۹۶۰ء میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے عراق گئے اور مشرقِ وسطیٰ
کی سیاحت کی۔ ۱۹۶۱ء میں یونیسکو کی فیلوشپ ملی اور اس سلسلے میں
یورپ' امریکہ اور مشرق بعید کا دورہ کیا۔ ۱۹۶۲ء میں بین الاقوامی
سیمینار منعقدہ ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) میں پاکستان کے مندوب کی
حیثیت سے شرکت کی۔ ۱۹۷۳ء میں حج کی سعادت حاصل کی۔ ۱۹۶۰ء
سے ۱۹۸۳ء تک پاکستانی مندوب کی حیثیت سے تین مرتبہ روس اور
تین مرتبہ چین گئے۔ پانچ مرتبہ امریکہ کا تفصیلی دورہ بھی کیا ہے۔
یوگوسلاویا' چیکوسلاویا' اسپین' ناروے' ڈنمارک' سوئیڈن اور آئس
لینڈ کے سفر بھی کر چکے ہیں" (فلیپ: حرفے چند)

"میں دنیا کی تقریباً تمام فضائی کمپنیوں سے سفر کرچکا ہوں اور کرتا رہتا ہوں" (روزنامہ جنگ لاہور '۱۲- فروری ۱۹۹۱ء)

مصروفیات : وفاقی گورنمنٹ ایمپلائز یونین' اسسٹنٹ سیکریٹری' ۱۹۴۸ء

انکم ٹیکس آفیسرز ایسوسی ایشن' بانی و پہلے سیکریٹری (۱۹۵۲ء)

پاکستان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی (پی-ای-سی-ایچ-ایس' کراچی) منتخب رکن منتظمہ (۶۱-۱۹۵۶ء)

رائٹرز گلڈ : اعزازی مرکزی سیکریٹری (۶۷-۱۹۵۹ء)' منتخب سیکریٹری جنرل (۷۰-۱۹۶۷ء)

انجمن ترقیٔ اردو پاکستان- رکن منتظمہ (۶۲-۱۹۵۹ء)- معتمد اعزازی (۱۹۶۲ء تا حال)

اردو کالج کراچی- معتمد اعزازی (۱۹۵۹ء سے قومیائے جانے تک)

اردو کالج کراچی کے دونوں حصوں (سائنس اور آرٹس) کے معتمد اعزازی (۱۹۶۷ء سے قومیائے جانے تک)

مرکزی اردو بورڈ' لاہور	رکن
اردو ڈکشنری بورڈ' کراچی	رکن
نیشنل بک کونسل آف پاکستان' اسلام آباد	رکن
کاپی رائٹ ٹربیونل' حکومت پاکستان	رکن
مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد	مجلس نظماء کے رکن
نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد	منتخب ڈائریکٹر
ادیب سہارنپوری ٹرسٹ' کراچی	صدر ۱۹۶۴ء
نظر حیدر آبادی ٹرسٹ' کراچی	صدر ۱۹۶۴ء
صبا ٹرسٹ (سید سبط علی (۳)' واہ کینٹ	سرپرست
سلیم احمد ٹرسٹ' کراچی' ۱۹۸۳ء	فاؤنڈنگ رکن
افکار ٹرسٹ' کراچی	فاؤنڈنگ رکن

۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۶ء تک روزنامہ جنگ کے سنڈے ایڈیشن میں

سفرنامے لکھتے رہے۔ ۱۹۶۷ء سے تا حال روزنامہ جنگ میں "اظہاریہ" لکھ رہے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام چھپنے والی کتابوں پر "حرفے چند" کے عنوان سے مقدمہ لکھتے ہیں۔

ایڈیٹر ماہنامہ قومی زبان، کراچی، ۱۹۶۲ء تا حال
ایڈیٹر ماہنامہ ہم قلم، کراچی، ۱۹۶۱ء ۔ ۱۹۶۶ء
سہ ماہی اردو، کراچی (رکن مجلس ادارت) ۱۹۶۲ء تا حال

۱۹۷۶ء میں چار ماہ، پاکستان ٹیلی ویژن سے "دنیا پاکستان" کے عنوان سے ایک پروگرام کیا۔

۱۹۷۷ء میں حلقہ ۹۔۱۹۱ کراچی سے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑے لیکن ہار گئے۔ عالی صاحب پی پی پی کے امیدوار تھے۔ ان کے مقابل پی این اے کے مشترکہ امیدوار سید منور حسن (حال امیر جماعتِ اسلامی، کراچی) تھے۔

گلڈ کی تاسیس :

"ایک رات ہم سلیم احمد کے ساتھ ان کے گھر سے نکلے اور قریب کے چائے خانے میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہیں رائٹرز گلڈ قائم کرنے کی تجویز سلیم احمد نے پیش کی اور پھر کافی دیر تک اس موضوع پر ہم باتیں کرتے رہے لیکن اس محفل میں صرف گفتگو ہو کر رہ گئی۔ بعد میں، میں اس خیال کو لے کر چلا۔ چند روز بعد آٹھ ادیبوں کی جانب سے ایک ڈیکلریشن پر سائن کئے اور ادیبوں کا کنونشن بلانے کی اپیل کی۔ ان آٹھ ادیبوں میں میرے علاوہ قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب (سیکریٹری ٹو پریذیڈنٹ)، ابن سعید، ابن الحسن، ضمیر الدین احمد اور غلام عباس وغیرہ شامل تھے۔ لفظ "گلڈ" ابن الحسن نے تجویز کیا تھا۔ کنونشن میں دو سو بارہ ادیبوں نے شرکت کی تھی۔ ان میں ساٹھ ادیب مشرقی پاکستان کے تھے۔
(طاہر مسعود، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، ص ۲۲۹)

گلڈ کا منشور :

"ہم پاکستان کے ادیب جو ملک کی تمام زبانوں کی نمائندگی کرتے ہیں، خود کو مادرِ وطن کی ترقی اور عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں۔ ہم ان حقوقِ انسانی پر یقین رکھتے ہیں۔ جن کی تشریح اقوام متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں۔ جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں، پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس فرض سے جو سچائی کی عکاسی، قوم پرستانہ قدروں کی نشوونما، بین الاقوامی اخوت اور تعاون کے فروغ اور تمام انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے۔ کماحقہ، آگاہ ہیں۔ تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایسے خوش حال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کے لئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں، اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی قدروں اور روحانی تصورات کے تابع ہوں۔ بنا بریں ہم علم و سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوشحالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں"۔

(ماہنامہ افکار، کراچی، کنونشن نمبر، مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۴۷)

گلڈ اور عالی کی خدمات :

"گلڈ کے لئے سب سے زیادہ کام جمیل الدین عالی نے کیا تھا۔۔۔ عالی کی اس ضمن میں کوششیں گلڈ کی تاریخ کا اہم ترین باب مرتب کرتی ہیں۔"

(میرزا ادیب۔ مٹی کا دیا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۳۸۱)

ایوارڈز :

۱۔ کینیڈین اردو اکادمی ٹورنٹو۔۱۹۸۸ء
۲۔ سنت کبیر ایوارڈ از عالمی اردو کانفرنس، دہلی، ۱۹۸۹ء
۳۔ صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی (شعبۂ ادب) ۱۹۹۱ء

خطاب : خادم اردو از مالک رام
(جمیل الدین عالی: فن اور شخصیت، ص ۸۰)

تصانیف :

۱۔ غزلیں، دوھے، گیت : طبع اول ۱۹۵۸ء، طبع دوم ۱۹۷۳ء، طبع سوم ۱۹۸۴ء، طبع چہارم سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء
۲۔ جیوے جیوے پاکستان : لارک پبلشرز، کراچی، ۱۹۷۴ء، ۱۹۷۶ء، نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۸۸ء)
۳۔ لاحاصل : طبع اول ۱۹۷۴ء، طبع دوم، مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۹۸۴ء، طبع سوم، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۸ء)
۴۔ دوھے (اردو رسم الخط میں) : مرتبہ ایم۔ حبیب خان، مکتبہ جامعہ، نئی دلی، ۱۹۸۴ء
۵۔ دوھے (دیوناگری رسم الخط میں) : مرتبہ ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء
۶۔ نئی کرن۔ کراچی، ۱۹۵۹ء
۷۔ سنگھائی کی عورتیں (شریک مترجم)، الفتح پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۷۲ء
۸۔ ایشین ڈرامہ (شریک مترجم)، نیشنل بینک آف پاکستان، کراچی، ۱۹۷۶ء
۹۔ دنیا مرے آگے، طبع اول ۱۹۷۵ء، طبع دوم، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۴ء
۱۰۔ تماشا مرے آگے، طبع اول ۱۹۷۵ء، طبع دوم، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۸۵ء

۱۱۔ صدا کر چلے، شاہکار بک فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۸۵ء، طبع دوم، شاہکار بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۶ء

۱۲۔ دعا کر چلے، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۷ء

۱۳۔ حرفے چند، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۸ء

غیر مطبوعہ / زیر ترتیب:

۱۔ انسان (طویل نظمیہ)

۲۔ سفرنامہ آئس لینڈ

۳۔ جدید اقتصادی اصطلاحات (شریک مترجم)

۴۔ نقار خانے میں (کالموں کا انتخاب)

۵۔ اصطلاحاتِ بینکاری، شریک مولف (گیارہ ہزار اصطلاحات)

ترتیب طلب:

۱۔ سفرنامہ چین

۲۔ خطوط عالی

۳۔ مکاتیب مشاہیر (بنام عالی)

۴۔ شخصی مضامین

۵۔ حرفے چند (دوسری جلد)

۶۔ نیا شعری مجموعہ (۱۹۸۴ء تا حال)

۷۔ مضامین

۱۔ موضوع کی منظوری اردو بورڈ آف اسٹڈیز پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اجلاس بتاریخ ۵۔دسمبر ۱۹۹۱ء میں دی گئی اور مقالہ جمع کرا دینے کی آخری تاریخ، رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی لاہور کے مراسلے نمبر ۱۱۵/ جی ایم، مورخہ ۲۵۔فروری ۱۹۹۲ء کے مطابق ۱۵۔مارچ ۱۹۹۲ء مقرر ہوئی۔

۲۔ تقسیم ہندوستان کے بعد اس کالج کا نام دلی کالج رکھا گیا۔ اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی وفات کے بعد اس کا نام ڈاکٹر ذاکر حسین کالج قرار پایا۔ کالج کے قدیم طلبہ جن میں اختر الایمان، علی سردار جعفری اور جمیل الدین عالی شامل ہیں، نے حکومت ہند پر زور دیا کہ وہ کالج کے پرانے نام کو قائم رکھے اور کوئی نئی عمارت تعمیر کرکے ڈاکٹر صاحب سے منسوب کرے۔

(جمیل الدین عالی : راقم مقالہ سے گفتگو، ۲۹۔نومبر ۱۹۹۱ء، حبیب بینک پلازا، کراچی)

- صبا کے انتقال کے بعد جمیل الدین عالی کی کوششوں سے صبا کے لواحقین کی مالی امداد اور مرحوم کے مجموعہ کلام کی اشاعت کا بندوبست کرنے کی غرض سے صبا ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا گیا۔

(سید سبط علی صبا ---- شخصیت اور فن (مقالہ) اختر شاد، ص ۳۲)

شخصیت

تو اے مجموعہ خوبی بہ چہ نامت خوانم

☆

"------ جمیل الدین عالی ------"

سرخ و سفید رنگ، روشن اور کشادہ پیشانی، گھنے اور ملے ہوئے ابرو، لمبی لمبی خوبصورت پلکیں اور ان کی چھاؤں میں مسکراتی ہوئی گہری اور پرکشش آنکھیں، جن میں ذہانت اور شوخی کی چمک دم بہ دم کوندے کی طرح لپکتی ہوئی، ذرا نکلتا ہوا قد اور چھریرا بدن، کاندھوں پر ایک عجیب دلاویز شان استغنیٰ کے ساتھ ایک چادر ڈالے ہوئے، محفل میں بیٹھ کر بھی اپنے ہی خیالوں میں گم۔ ہاتھ میں سگریٹ سلگتے سلگتے انگلیوں تک پہنچ چکی ہے، مگر وہ آنکھیں بند کئے جیسے اپنے ہی کسی شعر کے سرور میں کھویا ہوا ہے"۔

(سلیم احمد، کاروان نمبر۲، کراچی، ص ۷۹)

☆

"------ جمیل الدین عالی اپنی زندگی کے متنوع تجربات کی کثرت کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں اور ہم عمروں سے بڑھا ہوا ہے۔ اس کی زندگی کثیرالجہات اور کثیرالواردات ہے۔ اس نے زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور بے شمار روح فرسا اور جان گداز مرحلوں سے گزرا ہے۔ اچھے برے، پست و بلند، شریف اور کمینے ہر طرح کے تجربات سے دوچار ہوا ہے۔ پھر وہ احساس کا آدمی ہی نہیں ہے، ذہن کا آدمی بھی ہے۔ وہ محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ سوچنا بھی جانتا ہے ------"

(ڈاکٹر عبدالسلام، سیپ، کراچی، شمارہ ۳۱، ص ۱۷۷)

☆

"جمیل الدین عالی نے اپنے نام اور تخلص کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ عمر کی ساٹھویں منزل پر (بھی) وہ مردانہ حسن کی ہنستی بولتی، مسکراتی، چلتی پھرتی تصویر نظر آتے ہیں۔ دور سے دیکھیں تو ایک جوان رعنا معلوم ہوں گے اور قریب سے نگاہ ڈالئے تو لباس حریر و پرنیان میں ایک یونانی دیوتا دکھائی دیں گے۔ عالی کہنے کو تو ان کا تخلص ہے مگر یہ تخلص ان کی شخصیت کا ایک ایسا جزو بن گیا ہے جسے ان سے جدا نہیں کیا جا سکتا وہ ہمیشہ سے ------ کم از کم جب سے میں نے انہیں دیکھا ہے ------ اپنے مرتبے اور منصب کے لحاظ سے عالی رہے ہیں اور بدستور ہیں۔ بلکہ اس زمانے میں تو کچھ زیادہ ہی عالی ہو چکے ہیں۔ یوں بھی وہ نسباً" عالی ہیں۔ ایک ایسے خانوادۂ عالیہ کے رکن ہیں جس کے ایک فرد مرزا غالب بھی تھے۔

شاعروں کے بارے میں عموماً کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں کہنے کے لئے آئے ہیں، کرنے کے لئے نہیں۔ مگر عالی نے اپنی زندگی میں اتنا کچھ کہا ہے کہ اور اتنا کچھ کیا ہے کہ انہیں گفتار کا غازی ہی نہیں، کردار کا غازی بھی کہا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ان کے کردار کا تعلق ہے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ رائٹرز گلڈ کی تعمیر و تشکیل ہے۔ اس ادارے کے پس منظر پر نظر ڈالئے تو سب سے طویل سایہ جمیل الدین عالی ہی کا دکھائی دے گا۔"

(میرزا ادیب، تخلیقی ادب ۳، کراچی ۱۹۸۳ء، ص ۷۶۵)

☆

"شاعروں کے بارے میں عموماً سمجھا جاتا ہے کہ محض گفتار کے غازی ہوتے ہیں، عملی زندگی میں ایک مرد عمل کی حیثیت سے کامیاب ہونا ان کے بس کا روگ نہیں، مگر عالی نے شاعری کے علاوہ بھی عملی زندگی میں اتنا کچھ کر کے دکھایا ہے کہ ان کی صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ شہزادوں کے خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود حالات کی ستم ظریفی کے باعث (کلرک) کی سطح سے عملی زندگی کا آغاز کر کے نیشنل بینک اور پاکستان بینکنگ کونسل کے ممتاز ترین مناصب عالیہ تک پہنچنا کوئی ہنسی کھیل نہ تھا مگر عالی نے اپنے تخلص کو محض تخلص ہی نہیں رہنے دیا بلکہ صحیح معنوں میں اپنے مرتبہ و منصب کے لحاظ سے عالی بن کر دکھایا اور وہ بھی محض اپنی انتھک محنت اور صلاحیت کے بل بوتے پر۔ سو اب ان کا تخلص بقول شخصے ان کی شخصیت کا ایسا جزو بن چکا ہے جسے کسی حال میں ان سے جدا نہیں کیا جا سکتا"۔

(علی حیدر ملک، جمیل الدین عالی۔ فن اور شخصیت، مرتبہ ایم حبیب خان، دہلی ۱۹۸۸ء، ص ۸۰)

☆

"عالی صاحب نے جس شوق و شغف کے ساتھ اور بڑی حد تک نا سازگاری حالات میں اپنی تعلیم کو مکمل کیا اور ایک نو آفریدہ ملک میں ترقی کرتے ہوئے ایک بلند مقام تک پہنچے، جہاں عزت، شہرت اور دولت پھر ان کے ہمزاد فرشتوں کی طرح ان کی زندگی کا حصہ بن گئیں۔ وہ خود اپنی جگہ لائق تعریف اور قابل تحسین ہے لیکن ان کی شخصیت کی کشش ہمیں کچھ اس سے بھی آگے لے جاتی ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے اور ہوتا رہا ہے کہ زندگی میں بڑائیوں کی طرف سفر آدمی کو بہت سی خوبیوں سے دور کرتا جاتا ہے لیکن عالی صاحب کے یہاں صورت حال مختلف رہی۔ وہ جتنا خاندانی طور پر بڑے تھے اتنا ہی ذاتی طور پر بڑے آدمی بنے اور جتنا جتنا ان کے قدم آگے بڑھتے گئے ان کی نظر میں انسانی خوبیوں کی قدر و قیمت اسی نسبت سے کچھ اور آگے بڑھ گئی اور وہ زندگی کی اچھائیوں اور سچائیوں سے اور بھی قریب ہوتے گئے۔

کچھ عجب حالت ہے راہ منزل مقصود کی
جتنا جتنا میں بڑھا میرا سفر بڑھتا گیا

عالی صاحب نے اپنی زندگی کے سفر میں اپنے ادبی ذوق کی تربیت اور اپنے تخلیقی شعور کے فنکارانہ اظہار پر ہمیشہ توجہ مبذول رکھی۔ میرے نزدیک ان کی انسانی شخصیت کی بڑائی کا سب سے اہم پہلو ان کے یہاں اعلیٰ انسانی قدروں کا احترام اور ادب و شعر سے ان کا تعلقِ خاطر ہے جو "فرسٹ لو" کا سا درجہ رکھتا ہے"۔

(ڈاکٹر تنویر احمد علوی، جمیل الدین عالی------ فن اور شخصیت، دہلی ۱۹۸۸ء ص ۶۸۔ ۶۹)

☆

"(عالی) اتنے اچھے دوست ہیں کہ اگر ادب میں، دوستی کوئی صنف شمار ہوتی تو اس صنف میں وہ نہایت اعلیٰ مدارج پر فائز ہوتے"۔

(فیاض اعوان، ماہنامہ خوبصورت، کراچی، جولائی ۱۹۹۱ء، ص ۲۵)

☆

"یہ ایک بہت بڑا مشاعرہ تھا۔ سامعین میں ہندوستانی اور پاکستانی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ اب مجھے الگ الگ تو اندازہ نہیں کہ ہندوستانی کتنے تھے اور پاکستانی کتنے لیکن چوں کہ

بنیادی طور پر اس مشاعرے میں پاکستانی شعراء ہی شریک تھے اور ان کے سفر کا انتظام بھی پاکستان کے ایک ادارے نے کیا تھا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ پاکستانی سامعین کی تعداد ہندوستانی سامعین سے زیادہ ہو۔ اس میں جمیل الدین عالی نے اپنی نظم "جیوے جیوے پاکستان" پڑھی جسے سامعین نے بہت پسند کیا۔ یہ نظم یا گیت جب خاتمے کے قریب پہنچا تو عالی صاحب نے کہا کہ جس قدر پاکستانی یہاں ہیں وہ میرے ساتھ اس نظم کے (ٹیپ کے) مصرعے دہرائیں چنانچہ یہی ہوا اور ہال "جیوے جیوے پاکستان" کی مترنم آوازوں سے گونج اٹھا۔ جب عالی صاحب نظم پڑھ کر ڈائس پر آئے تو میں مائکروفون پر گیا اور وہاں اس نظم کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہا کہ عالی صاحب نے یہ مطالبہ صرف پاکستانی سامعین سے کیوں کیا ہے کہ وہ اس نظم کے مصرعے ان کے ساتھ دھرائیں۔ میں بطور ایک ہندوستانی کے، اس بات کے لئے دعاگو ہوں کہ پاکستان زندہ و پائندہ رہے اور میں تو اس ہندوستانی کو ہندوستانی نہیں سمجھتا ہوں جو پاکستان کی ترقی، خوش حالی اور پائندگی کا آرزو مند نہیں------ شاید یہ فقرہ ابھی میں نے مکمل ہی نہیں کیا تھا کہ عالی صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور آکر بے اختیار مجھ سے لپٹ گئے اور کافی دیر تک اسی عالم میں رہے۔ اس وقت کا عالم قابل دید تھا۔ اب میں شاید اسے لفظوں میں بیان نہ کر سکوں۔ ہال تو خیر کافی دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ عالی صاحب نے امریکہ کی سرزمین پر ہندوستان اور پاکستان کی دوستی کی ایک ایسی تصویر پیش کی جو ابھی تک میرے دل پر ثبت ہے اور امریکہ کے اکثر پاکستانی اور ہندوستانی گھروں میں اور لائبریریوں میں ویڈیو ٹیپ کی صورت میں بھی موجود ہے"۔

(جگن ناتھ آزاد، جمیل الدین عالی۔ فن اور شخصیت، دہلی ۱۹۸۸ء، ص ۵۳-۵۴)

☆

"میں نے عالی کے مزاج میں سادگی اور شخصیت میں خاص قسم کی دل کشی پائی۔ اس کے علاوہ ان کو انسانوں سے بے حد پیار اور انسیت ہے۔ چھوٹوں سے شفقت اور بزرگوں کا احترام ان کی وضعداری میں شامل ہے۔ قومی نغمہ "جیوے جیوے پاکستان" نے بھی عالی صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا ہے"۔

(ایم حبیب خان، جمیل الدین عالی۔ فن اور شخصیت، دھلی ۱۹۸۸ء، ص ۹۳)

☆

"عالی ایک باشعور فرد اور ہر بات کی تہ میں اتر جانے والا آدمی ہے۔ اس نے ہمیشہ اپنی

ذہانت کی روشنی میں بلند سے بلند تر کی طرف پرواز کی ہے"۔

(یونس احمر، ایضاً، ص ۳۲۴)

☆

"(عالی) کی شخصیت کا یہ پہلو بھی بے حد اہم ہے کہ وہ صرف اور صرف پیش منظر کے آدمی ہیں، پس منظر کے نہیں۔ اگر ہم اپنے ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکری لے کر کھڑے ہو جائیں اور ان کے متعدد کارناموں پر ان کے اوپر برسائیں تو ادب کے میدان میں ان کے کئی کارنامے ایسے ہوں گے جو شاید شمار میں ہی نہ آسکیں مثلاً انہوں نے پاکستان رائٹرز گلڈ کے پلیٹ فارم سے ادب (اور) ادیبوں کے لئے بہت کام کئے بلکہ بہت سے وہ کام جو کئی ادبی ادارے اب مل کر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی ابتداء عالی نے کی۔ انہوں نے پاکستان کے استحکام اور بلندی کے لئے بہت لکھا بلکہ اب بھی گلی گلی، بچہ بچہ ان کے الفاظ کو دھراتا ہے کہ ------جیوے جیوے پاکستان"۔

(اختر امان، سات رنگ، نصرت پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۹)

☆

"عالی بہت محبت کرنے والے آدمی ہیں۔ میں دلی کے زمانے سے ان کا واقف ہوں۔ وہ انتھک محنت اور لگن سے اپنی شخصیت کے امکانات کو بروئے کار لائے۔ وہ نہ صرف ادیبوں کے کام آئے بلکہ انہوں نے کتنے ہی دوسرے لوگوں کی بھی خدمت کی۔ میں بینک میں ان کے ساتھ رہا ہوں------ وہ میرے محسن ہیں جن دنوں میں میں بیمار تھا انہوں نے مجھے اپنی گاڑی دی۔ کیوں کہ میرے گھروالوں کو ہسپتال آنے جانے میں خاصا تردد کرنا پڑتا تھا"۔

(جمال پانی پتی، راقم مقالہ سے گفتگو، یوسف پلازا، کراچی، یکم۔ دسمبر ۱۹۹۱ء)

☆

"ہم دلی کالج میں اکھٹے پڑھتے تھے۔ ان سے دوستی کا آغاز اسی دور میں ہوا اور الحمداللہ ابھی تک قائم ہے۔ عالی بہت مخلص انسان ہیں۔ انہوں نے کئی لوگوں کو نوکریاں دلائیں------ ادب میں ان کا کیا مقام ہے؟ یہ دیکھنا نقادوں کا کام ہے۔ ہم تو انہیں بحیثیت انسان کے جانتے ہیں اور اس حوالے سے وہ بہت بلند ہیں"۔

(محمد عمر، راقم مقالہ سے گفتگو، جم خانہ کلب، کراچی، ۳۰، نومبر ۱۹۹۱ء)

☆

"(رائٹرز) گلڈ کی تنظیم و تعمیر کا سہرا دراصل جمیل الدین عالی کے سر ہے۔ اپنی نوابانہ کجکلاہی، شاعرانہ نازک مزاجی، جبلی زود رنجی، ذکی الحسی اور طبعی لاابالی پن کے باوجود انہوں نے جنون کی حد تک دھن، لگن اور خلوص کے ساتھ گلڈ کے لئے انتھک کام کیا۔ طرح طرح کے نامساعد حالات میں انہوں نے ہر قسم کی مخالفت اور مزاحمت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اس معرکہ آرائی میں انہیں انواع و اقسام کے مصائب اور اذیتوں سے بھی گزرنا پڑا۔ ایک بار تو وہ اسی کش مکش میں کچھ عرصہ کے لئے اپنی ملازمت تک سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لیکن گلڈ کے لئے ان کے جذبۂ خدمت میں کمی نہ آئی۔ میں نہایت ایمانداری سے اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ گلڈ کے ادارے سے عالی صاحب نے اپنی ذات کے لئے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا"۔

(قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، بار دوم، ستمبر ۱۹۸۷ء، ص ۷۵)

☆

"ڈکٹیٹرانہ شان رکھنے والے مگر مصلحت انگیزی میں طاق، معاملہ فہم مگر ضد کے بادشاہ، مخلص اتنے کہ مسکرا مسکرا کے رجھا دیں، جانب دار اتنے کہ اصول شرما جائیں۔ رائٹرز گلڈ کے ناخدا! مگر خود گلڈ کی دریافت! ------ نام نامی جمیل الدین عالی! اور ساتھ ہی ------ ایک بے حد معتبر آدمی! اس معتبر آدمی کے جو لوگ قریب ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بہت اچھے آدمی ہیں"۔

(محمد طفیل، محترم، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۳)

☆

"عالی کے دو روپ ہیں۔ ایک عالی وہ ہے جو اپنی شاعری میں راجہ اندر دکھائی دیتا ہے ایک ایسا شخص جو حسین و جمیل ہے، جس میں دوسروں کو لبھانے اور چاہے جانے کی شدید خواہش ہے جو یہ سمجھتا ہے دنیا میں سب سے حسین چیز اس کی اپنی ذات ہے۔ جسے یہ گمان ہے کہ ساری دنیا کے پری رو اس پر مرتے ہیں۔ جو اپنے آپ کو مرزا پارس ناتھ خیال کرتا ہے اور اس کا لمس انسانوں کو سونا بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ سندر ناریں اسی کا دم بھرتی ہیں۔ شہرت اس کے پاؤں چومتی ہیں اور عشق و عاشقی کے سوا دن رات اسے کوئی کام نہیں۔ یہ

جمیل الدین عالی ایک نواب زادہ ہے جسے دنیا جہان کی آسائشیں میسر ہیں۔ اس کے ہاں رنگ و رامش کی محفلیں جمتی ہیں اور اس برات کا دولہا وہ خود ہے وہ مرزا غالب کے خاندان کا فرد ہے اور آغاز جوانی کے سارے قصے، جو غالب کے ساتھ مشہور ہیں، جمیل الدین عالی کو اپنی ذات کے ساتھ منسوب دکھائی دیتے ہیں، اسے خانوادہ غالب سے متعلق ہونے پر فخر ہے۔ مرزا کی عیش پسندی اس کا آئیڈیل ہے اور انا کے سہارے وہ اپنی شاعری کے لب و لہجہ کو بھی مرزا غالب کے قریب تر رکھنے کی کوشش کرتا ہے"۔

(ڈاکٹر وحید قریشی، جدیدیت کی تلاش میں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳۸۸)

☆

"عالی لاکھ عجز و انکسار کی باتیں کریں، وہ غالب کی طرح ایک زبردست انا کے مالک ہیں۔ ان کے انکسار میں بھی افتخار کے سینکڑوں پہلو نکلتے ہیں چاہے اس کا تعلق عاشقی سے ہو یا اپنی سخن وری سے"۔

(پروفیسر مسعود حسین خان، جمیل الدین عالی ——— فن اور شخصیت، دہلی ۱۹۸۸ء، ص ۲۳)

☆

"——— کیا خود پرستی، دنیا طلبی اور مصلحت اندیشی انسانوں میں نہیں پائی جاتی ——— اور ذرا اپنے ضمیروں اور دلوں کا جائزہ لیجئے کیا ہم سب میں ایک ایسا ہی انسان موجود نہیں ہے ——— پھر اپنے آپ کو دھوکا نہ دیجئے کہ عالی ایسا ہے اور ہم ایسے نہیں ہیں۔ ہم بھی ایسے ہیں مگر ہاں اور نہیں کے درمیان لٹکے ہوئے، ہم میں عالی میں یہ فرق ہے کہ عالی جانتا ہے کہ وہ کیا ہے اور ہم نہیں جانتے ——— یا جانتے ہیں مگر ہمیں اس کے اثبات کا موقع نہیں ملتا یا موقع ملتا ہے اور ہمت نہیں ہوتی یا ہمت بھی کرتے ہیں تو صلاحیت جواب دے جاتی ہے ——— عالی میں خود آگاہی اور خود اثباتی کی قوت، اس کے تمام ہم عمروں اور ہم عصروں سے زیادہ ہے ———"

(سلیم احمد، سیپ، شمارہ ۳۱، کراچی، ص ۱۷۱)

☆

"——— عالی صاحب کا سا چھوٹوں سے محبت اور ان کو آگے بڑھانے کا جذبہ

------میں نے بہت کم ادبی شخصیتوں میں دیکھا بلکہ بعض اردو کی ایسی شخصیتیں موجود ہیں جو اپنے ہم عصروں کو آگے بڑھانے کے بجائے ان کو دبا کر رکھتی ہیں"۔

(ایم حبیب خان، جمیل الدین عالی۔ فن اور شخصیت، دہلی ۱۹۸۸ء، ص ۷)

☆

"عالی کے انسان دوست ہونے نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ عالی نے اپنی آنکھیں عطیہ دی ہیں کہ یہ ان کے بعد کسی محتاج کو لگا دی جائیں------ عالی کی انسان دوستی پر، اس کے انسانی مقاصد کی بلندی پر، اس کے انسان کے خلیفتہ اللہ فی الارض ہونے کے ایمان پر کون شبہ کر سکتا ہے------"

(مالک رام، جمیل الدین عالی------ فن اور شخصیت، ایضاً، ص ۱۳، ۱۹)

"عالی جی ایک دوست ہیں اپنے جن کا ہے یہ کام
جیون بھر نردوش رہیں اور جیون بھر بدنام
کوئی کہے یہ لئے پھرے ہے روز نئی اک نار
کوئی کہے یہ بڑا سکھی ہے اس کے ہزاروں یار
کوئی کہے یہ پھلواری ہے کوئی کہے ویران
کوئی کہے یہ بگلا بھگت ہے کوئی کہے گنوان
کوئی کہے یہ راج کوئی ہے سورج اس کی راس
کوئی کہے یہ سوکھا پھول ہے اس میں رنگ نہ باس
کوئی کہے اسے جیون ساتھی کوئی کہے جنجال
کوئی کہے اسے اتھلا پانی کوئی کہے پاتال
کس کو خبر یہ ہنس مکھ عالی کیا کیا چھپ کر روئے
جیسا ساتھی من ڈھونڈے تھا ویسا ملا نہ کوئے

جمیل الدین عالی

(تخلیقی ادب ۳، کراچی، اکتوبر نومبر ۱۹۸۳ء، ص ۸۲۸)

عالی کی سفر نامہ نگاری
فکری اور فنی جائزہ

(۱)

انسانی زندگی روح اور جسم کی ترکیب سے عبارت ہے۔ ان دونوں کی باہمی یکجائی حرکت اور عمل کا باعث بنتی ہے جو سفر کی بنیادی صفات ہیں۔ سفر' ان انجانے خوابوں کی تعبیر ہے جو ایک انسان اپنے من میں دیکھتا ہے۔ جب یہ تصور حقیقت کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے تو انسان تحیر کی دنیا سے نکل کر احساس اور مشاہدے کے عالم سے روشناس ہو جاتا ہے۔ دراصل انسان کے باطن میں ایک ایسا جذبہ کارفرما ہے جو اسے ان دیکھے دیسوں کو دیکھنے اور ان دلفریب و دلربا فضاؤں میں سانس لینے کے لئے اکساتا رہتا ہے۔ یہ جذبہ جب بیدار ہو جائے تو انسان گھر کی چار دیواری سے خوشبو کی طرح باہر آجاتا ہے اور ان راستوں پر چل نکلتا ہے جو کبھی اسے حیرت و تحیر کے طلسم کدوں میں بھٹکاتے اور کبھی علم و آگہی کے لالہ زاروں میں لے جاتے ہیں۔ کبھی وہ کرسٹوفر کولمبس کے روپ میں نئی دنیا دریافت کرتا ہے تو کبھی البیرونی کے بھیس میں دنیائے علم و حکمت میں نئے جزیرے تلاش کرلیتا ہے۔ سفر خارج کا ہو یا باطن کا' اس کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ انسان کا اپنے باطن میں سفر عرفان باری کا پیش خیمہ ہے۔ کیوں کہ دل دریا سمندروں ڈونگے ------ ان کی شناوری ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ------ انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد' اس کے برعکس خارج کا سفر ماضی و مستقبل کا سفر ہوتا ہے۔ کیوں کہ حال کے لمحہ موجود میں ماضی کی بازیافت اور مستقبل کی جھلک مشاہدے اور بصیرت ہر دو قوتوں سے اظہار کی راہ پاتی ہے۔ باطن کے زیر اثر خارج میں انسان کا سفر تہذیبی اور ثقافتی علامت کا تلازمہ ہے۔

سفر انسانی کا آغاز **کن فیکون** سے ہوتا ہے۔ اس زمین پر سفر اولین کی ابتدا ہبوط آدمؑ سے ہوئی۔ وہ سیرو فی الارض کا تحفہ اپنے نوشتہ تقدیر میں لکھا ہوا لائے تھے' بعد میں آنے والوں نے اس سنت کو برقرار رکھا۔ تقریباً تمام انبیائے کرامؑ نے مدارج حیات کی جہتوں میں مختلف النوع سفر کئے۔ ان میں سے کئی ایک کے سفر کی داستانیں قرآن حکیم کی زینت ہیں۔ نوح علیہ السلام کے بحری' ابراہیم علیہ السلام کے بری اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آسمانی سفر کی تفاصیل سے اوراق قرآن منور ہیں۔ یہ سفر اپنے دامن میں رحمتوں کے بے شمار خزینے لئے ہوئے ہیں۔ ان میں انسانیت کے لئے رہنمائی کا مژدہ بھی ہے اور کامرانی کی نوید بھی------ یوسفؑ و یعقوبؑ" سلیمانؑ و داؤدؑ اور موسیٰؑ و عیسیٰؑ کے سفر عالم شہود کی انتہاؤں کا پتہ دیتے ہیں۔ تو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر معراج لامکان کی وسعتوں میں جمال ایزدی سے سرافرازی کا امین ہے۔ چونکہ یہ سفر جسم و روح کے اشتراک اور امتزاج سے طے پایا اس لئے سفر فی الحضر کے منفی تصور پر کاری ضرب لگی۔ جس سے جامدیت کا طلسم ٹوٹ گیا۔

ہند کی مٹی ''سفر وسیلۂ ظفر'' اور ''حرکت میں برکت'' جیسے تصورات کے انجذاب کے لئے سازگار نہ تھی اس لئے مشرق کے باسی مدتوں تک ذوق سفر سے ناآشنا رہے۔ عالم شہود میں جہاں بینی کے تقاضے تخیلی سطح پر سیروسیاحت سے پورے نہیں ہوتے اس لئے روحانی تجربات سفر کا حصہ نہیں بن سکتے۔ ''**فصوص الحکم**'' کے ابواب ابن عربیؒ کی واردات روحانی کا منظر نامہ تو ہیں' سفر نامہ نہیں۔ اسی طرح منطق الطیر (شیخ عطارؒ)' طربیہ خداوندی (دانتے) اور جاوید نامہ (علامہ اقبالؒ) تخیلاتی ادب کے شاہکار ہیں' سفر تاثر نہیں۔ کیوں کہ روحانی حالات و واقعات کی پردہ کشائی ادب تو بن سکتی ہے' سفر نامہ نہیں۔ سفر نامہ لکھنے کے لئے سفر اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ غار میں بیٹھا کوئی صوفی یا دھونی رمانے والا جوگی اپنے تخیل کے زور سے دنیائے آب و گل کی رنگینیوں کا تصور تو کر سکتا ہے۔ لیکن سیاح کی طرح وہ اس لذت سے بہرہ یاب نہیں ہو پاتا جو راستے میں پیش آنے والے واقعات سے عبارت ہوتی ہے۔ سیاح چونکہ دو دنیاؤں کا سفر کر رہا ہوتا ہے' اس لئے اس کا مشاہدہ سفرنامے کا پیش خیمہ بھی ہے اور سفر کا ترجمان بھی۔ خارج کے مشاہدات باطن میں جاری تخلیقی عمل کی آنچ سے پک کر انگور کے رسیلے خوشوں کی طرح فرحت اور مسرت کا باعث بنتے ہیں۔ جس طرح سفر زندگی کا استعارہ ہے۔ اسی طرح مشاہدہ سفرنامے کی علامت ہے۔ یہ علامتیں اور استعارے محسوسات کو

حقیقت سے قریب کرتے اور زندگی کی گہری معنویت میں رنگ بھرتے ہیں۔ سفری حالات خارج اور باطن کی باہمی فکری آمیزش سے سفرنامے کے روپ میں ڈھلتے ہیں۔ جہاں مناظر حیات لفظوں کی تمثیلوں میں رنگ و نور اور نغمہ و نکہت کا سراپا اوڑھ لیتے ہیں۔ کیفیت سفر لفظوں کے پردوں سے منکشف ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ قدیم یونان اور ہندوستان میں سفر کے حالات کہانیوں کی صورت میں ملتے ہیں' جو مافوق الفطرت حالات و واقعات سے ترتیب پاتی ہیں۔ ان میں دیو مالائی عناصر کی بہتات ان تہذیبی رویوں کو سمجھنے میں ممد ہوتی ہے' جو عقائد کے تانے بانے سے تشکیل پاتے ہیں۔ کسی معاشرے میں حرکت و عمل پر اساطیری عناصر کا غلبہ اس کی آسیب زدگی کا پتہ دیتا ہے۔ کیوں کہ اس سے زندگی کے مختلف النوع رجحانات میں ٹھہراؤ آجاتا ہے جو اخلاقی قدروں کی کمی اور معاشرے کے متصادم رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس سے سوچ میں بلند آہنگی اور لہجے میں شعلہ نوائی پیدا نہیں ہوتی۔ البتہ اس احساس شکست سے تاریخ اور سماج کے فکری دھارے متاثر ہوتے ہیں جس سے نمو کا عمل رک جاتا ہے۔ بالیدگی فکر و عمل زندگی ہے اور اس کے برعکس موت------ جامدیت' مادی اسیری ہے جو جسم کے ساتھ ساتھ روح پر بھی اثر انداز ہوتی ہے جبکہ :

"الحرکتہ برکتہ حرکات الظواھر توجب برکات السرائر"(۱)

سفر' زمان و مکان کو نئی معنویت سے آشنا کرتا ہے اور ذہنوں پر پڑا ہوا تعطل توڑ دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں منطقی سطح پر لاشعور کی تہہ داری بڑھ جاتی ہے اور کوئی بھی سیاح اپنے گردوپیش کے مناظر سے بے اعتنائی نہیں برتتا۔ وہ خارج کی متنوع فضا کو اپنا کر زندگی کی مختلف جہتوں کا تعین کرتا ہے۔ اس کا مشاہدہ جتنا جاندار ہوتا ہے' سفرنامہ بھی اتنی ہی قدروقیمت کا حامل ٹھہرتا ہے۔

سفرنامہ نگار اپنے پیش نظر مناظر کا بیان اس انداز سے کرتا ہے کہ ان کی تصویریں اپنے تمام تر فطری رنگوں کے ساتھ قاری کی نظروں میں پھر جاتی ہیں۔ سفرنامہ پڑھتے ہوئے قاری اپنے آپ کو سفرنامہ نگار کے ساتھ انجانے دیسوں میں پاتا ہے۔ جہاں وہ مناظر میں جذب ہو کر فطرت کا حصہ بن جاتا ہے۔ سفرنامہ نگار:

"جغرافیائی کوائف کی متعین حدود سے قطع نظر کرتے ہوئے سفرنامہ کو ایک ذاتی واردات بنا دیتا ہے"(۲)

سفرنامہ محض تاریخ اور جغرافیہ کی معلومات کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ان حالات اور

واقعات کا بیانیہ ہوتا ہے جو کسی سیاح کو دوران سفر پیش آتے ہیں۔ یہ تاثرات سیاحتی کتابچوں میں مندرج معلوماتی گوشواروں سے ماخوذ نہیں ہوتے بلکہ اس کی اپنی واردات کا عکس ہوتے ہیں۔ چونکہ "باطن کا مشاہدہ ظاہر کے مجاہدہ سے وابستہ ہوتا ہے"۔(۳) اس لئے یہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ زندگی کا ارتقاع سفر کا مرہون منت ہے۔ اولیائے کرام کی زندگیوں میں سفر کی اہمیت اس حوالے سے سمجھی جاسکتی ہے۔

جب کوئی سیاح اپنے ذاتی تعصبات اور نظریات سے بلند ہو کر انسانی زندگی کی سچائیوں سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہے تو بہتیرے مسافر نواز اسے اپنی زندگی کے وسیع تجربات میں شامل کرلیتے ہیں۔ جہاں وہ لمحہ موجود کو مرکز مان کر ماضی اور مستقبل کی حدود کے تعین کے لئے قوسیں اور دائرے کھینچتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے سفرنامے کو تاریخ اور جغرافیہ کا اسیر نہیں ہونے دیتا۔ وہ موسموں کے رنگ اور مناظر کے عکس سے خوشبو کے وہ پیکر تراشتا ہے جو اس کے اپنے مشام جان کو معطر کرتے ہوئے قاری کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ سفر نامہ نگار بعض اوقات فاصلے کی مروجہ مکانیات کو زیر بحث نہیں لاتا۔ کیونکہ اس کی اپنی حرکت خط مستقیم میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے برعکس دوسری قوموں میں محوری اور کروی حرکت کا تصور پایا جاتا ہے۔ وہ ایک دائرے کی صورت میں محو سفر رہتی ہیں اور اسی گنجلک میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ اس لئے ان میں وسیع النظری پیدا نہیں ہوپاتی۔ محور کے ساتھ وابستہ رہ کر خط مستقیم میں حرکت اسلام کا امتیاز ہے۔ یہ انسانی شعور کی ارتقائی ترقی کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے۔ اسلام کا فلسفۂ حرکت ظاہری و باطنی ہر دو خوبیوں سے مملو ہے۔ اس سے سفر کا استعارہ صداقت اور روحانیت کے معنوی جمال کا حامل ٹھہرتا ہے۔ جس سے انسان کے دل میں حق پرستی کا جذبہ عود کر آتا ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سفرنامے کی روایت خاصی قدیم ہے۔ ظہور اسلام سے پہلے میگا سھنیز کے علاوہ ہمیں جن سفرنامہ نگاروں کے حالات نظر نواز ہوتے ہیں' ان کا تعلق بدھ ازم سے ہے۔ وہ اپنی عقیدت اور محبت کے حوالے سے بدھ کے آثار ڈھونڈتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں تاریخی حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ ذاتی تاثرات کا معتدبہ حصہ بھی شامل ہے جس سے ان کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ ویسے بھی:

"سفرنامہ ادبیات کی ایک نہایت مفید اور دلچسپ صنف ہے۔ جسے دنیا کی تمام زبانوں میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس سے نہ صرف دنیا کے تاریخی و جغرافیائی حالات' مذہبی و ثقافتی

کوائف اور معاشرتی و تمدنی خصائص کا پتہ چلتا ہے بلکہ قوموں کے جذبہ ترقی پسندی کو بھڑکانے اور ان کے ذوق اصلاح پذیری کو تیز کرنے میں بھی مدد ملتی ہے"۔(۴)

سفرنامے تہذیبی رویوں اور تاریخی بازیافت کے نقیب ہوتے ہیں۔ یہ تخلیقی عمل سے گزر کر شعور کی فکری معنویت پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں مصنف سفرنامے میں اپنی ذات کو بھی شامل کرلیتا ہے۔ جس سے اس کے تجربات، واقعات سے تخیلات کی سطح تک بلند ہوجاتے ہیں جو قاری پر کیف و کم کے در وا کردیتے ہیں۔ اس سے ایک کیف آور اور کیف گیر ماحول تخلیق ہوتا ہے جو خود کلامی سے ہم کلامی تک پھیل جاتا ہے۔ خیال انگیز تاثر کے فکری رویے زندگی کے تحرک کو معنویت کے نئے پن سے ملا دیتے ہیں۔ کیونکہ :

"سفر انسان کی بہت بڑی سرگرمی ہے۔ یہ مشغلہ بھی ہے، ضرورت بھی اور بعض حالتوں میں فرض بھی"۔(۵)

سفرنامے مسلمانوں کی مذہبی اور ثقافتی زندگی کے حوالے سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ دنیا میں جتنے سفرنامے انہوں نے لکھے ہیں، ان کا عشر عشیر بھی کسی قوم نے نہیں لکھے۔ "عرب دنیا کے مقامات" اور ہمارے ہاں کے "حج نامے" اور "سیاحت نامے" جدید مغربی و مشرقی سفر نامے کی بنیاد ہیں"۔(۶)

مسلمان سیاحوں کے سفرنامے ماضی کا تذکرہ بھی ہیں اور مستقبل کا پیش خیمہ بھی، یہ:

"ہماری تاریخ کا اہم باب ہیں۔ انسانی علوم و فنون اور تاریخ کے چشمے سفرناموں ہی سے پھوٹتے ہیں۔ اسی لئے سفرناموں کو قدیم ترین تاریخی و تہذیبی ماخذ قرار دیا گیا ہے"۔(۷)

اردو میں سفرناموں کی روایت پچھلی صدی سے قائم ہے۔(۸) دریں اثناء اس نوع ادب نے بہت ترقی کی۔ یہ نظم اور نثر ہر دونوں صورتوں میں لکھا گیا۔ سفرنامہ نثر میں مضمون، آپ بیتی، سوانح عمری، ناول، افسانہ، خط، روزنامچہ اور تحریری مکالمے کی صورت میں بھی لکھا گیا۔ یہ تکنیکی سطح پر اپنے خالق کے حسن طبیعت اور فنی بصیرت کا منت پذیر ہوتا ہے۔ وہ اسے جس صنف میں چاہے بیان کرسکتا ہے۔ اتنی آزادی شائد ہی کسی اور ادبی فن پارے کو میسر آئی ہو جتنی سفرنامے کو دی گئی ہے۔ سفرنامہ نگار اپنے مشاہدات سفر کسی بھی صنف ادب میں ڈھالنے کے لئے جتنا آزاد ہوتا ہے اس سے کئی گناہ زیادہ وہ پابند بھی ہوتا ہے اور یہ پابندی روح کی اس نقش گری کا تقاضہ کرتی ہے جو لفظوں کے قالب سے ہویدا ہو۔ یہ کام بصارت فکر کا ہی نہیں مہارت فن کا بھی ہے۔ کیونکہ :

"نقاش، صورت گر اور سنگ تراش کے فن میں یہ بات نہیں ہوتی، ان کے ابھارے ہوئے نقوش بے زبان ہوتے ہیں جب کہ شاعر و ادیب کے موقلم سے ٹپکنے والے حروف کو زبان مل جاتی ہے۔ ایسی زبان جسے روح کا نغمہ کہا جاسکے۔ فن یوں بھی خونِ جگر چاہتا ہے۔ خواہ وہ سنگ تراشی کا فن ہو یا صورت گری کا، نغمہ و نالہ کی اثر آفرینی بھی اسی کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ خونِ جگر کی آمیزش کے بغیر فن بازی گرانہ کرتب تو ہوسکتا ہے لیکن اس کے ذریعے لطیف جذبات کی تخلیق ممکن نہیں ہوتی"۔(۹)

(۲)

"اردو ادب کی تاریخ کے بہت سے ذمہ دار مورخ اس حقیقت کو شائد نظر انداز کرچکے ہیں کہ محمود نظامی کے منظر ناموں سے اردو سفرنامے کی جدیدیت کا آغاز ہوا تو اس افق پر اختر ریاض الدین اچانک وارد نہیں ہوگئیں۔ بلکہ محمود نظامی اور اختر ریاض الدین کے درمیان جمیل الدین عالی کے نام سے بھی ایک تابندہ ستارہ طلوع ہوا تھا۔ جس کی روشنی دور دور تک پھیلی اور جس نے سفرنامے میں جدیدیت اختیار کرنے والوں کو ایک نئی قسم کے پرسکون اجالے میں سفر کرنے کی دعوت دی"۔(۱۰)

قیام پاکستان کے بعد اردو سفرنامے کا جو نیا رجحان سامنے آیا۔ اس میں عالی کا سفرنامہ فکر و فن کی صورت گری کا وہ نقش اولین ہے جو روایت سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی جدت خیال اور ندرت اظہار کا آئینہ دار ہے۔

عالی جب پہلے عالمی سفر سے واپس آئے تو انہوں نے روزنامہ "جنگ" کے سنڈے ایڈیشن میں "دنیا مرے آگے" کے عنوان سے سفرنامہ لکھنا شروع کیا جو ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۶ء تک مسلسل چھپتا رہا اور ان کے اپنے بقول:

"تین ہفتے میں ہی وہ بے حد مقبول ہوگیا۔ پہلا سفرنامہ تھا اردو میں، جو اخبار میں آیا۔ جبکہ ویسے پاکستان میں دوسرا سفرنامہ تھا۔ مجھ سے پہلے نظامی صاحب نے لکھا تھا------اس کے بعد میں نے لکھا۔ میرے بعد اختر ریاض الدین نے لکھا۔ اس کے بعد تو سلسلہ سا چل نکلا"۔(۱۱)

عالی نے کم و بیش ساری دنیا کا سفر کیا۔ ایران، عراق، لبنان، مصر، دہلی، روس، فرانس، برطانیہ، جرمنی، اٹلی، ہالینڈ، پیرس، سوئزرلینڈ اور امریکہ کے سفرنامے ان کی دو کتابوں، "دنیا مرے آگے" اور "تماشا مرے آگے" میں شامل ہیں۔

"(ان کے) مطالعے سے فکری عمل اور رد عمل کی دنیا وسیع ہو جاتی ہے---- عالی صاحب کے اس سفر نامے کی دونوں جلدوں میں عبارت آرائی میں ترسیل و اظہار کی کوئی پابندی نظر نہیں آتی۔ ان میں دونوں مناصب کی آمیزش ہو جاتی ہے اور طرز سے زیادہ واقعہ نگاری، مقصود ٹھہرتی ہے جو فکر اور ماحول دونوں کی عکاس ہے"۔(۱۲)

یہ سفر نامے اپنے سادہ اور شگفتہ اسلوب کی وجہ سے بے حد مقبول ہوئے۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ ناشر کے اس قول سے ہوتا ہے:

"سلہٹ اور چاٹگام تک اردو پڑھنے والے بھی اچھے خاصے مجمع لگاتے اور پڑھوا کر سنتے تھے"۔(۱۳)

سفر ناموں کے یہ دونوں مجموعے ۱۹۷۵ء(۱۴) میں پہلی بار کتابی صورت میں سامنے آئے اور ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ چند ماہ بعد ہی ان کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ اگرچہ قارئین کی جانب سے مانگ برابر ہوتی رہی۔ لیکن بوجوہ ان کا دوسرا ایڈیشن جلد شائع نہ ہو سکا۔ دوسرا ایڈیشن آتے آتے نو سال لگ گئے۔ ۱۹۸۴ء میں "دنیا مرے آگے" اور ۱۹۸۵ء میں "تماشا مرے آگے" دوسری بار شائع ہوئے۔ بھلا ہو انشاء کا جس نے پہلی بار ان سفر ناموں کو اخباری کالموں سے نکال کر کتابی صورت دی۔ انہوں نے "دنیا مرے آگے" پر ایک خوبصورت دیباچہ بھی لکھا۔ اگر انشاء جی انہیں کتابی پیکر میں نہ ڈھالتے تو نہ معلوم عالی جی کی بے نیازی ان کے ساتھ کیا سلوک کرتی اور کب تک یہ اخباری صفحات میں ہی رہتے۔ ابن انشاء نے لکھا ہے کہ:

"یہ سفر نامہ اخباری صفحات پر بے طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس طومار کو دیکھ کر ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے اور یہ اس کو چھاپنے کا ارادہ ترک کر کے دو ہے کہنے لگتے تھے۔ آخر ہم نے اس طومار کو چھٹوایا۔ اس کی کتابت اپنی نگرانی میں کرائی۔ یہ کام بہت کچھ ہوا اور بیل منڈھے چڑھتی نظر آئی تو ان کا حوصلہ بھی بڑھا"۔(۱۵)

"دنیا مرے آگے" کا وہ حصہ جو ایران سے متعلق ہے۔ ۱۳- مئی ۱۹۶۳ء کو اخبار میں چھپا تو ایرانی سفارت خانہ کے کراچی میں مقیم پریس اتاشی ڈاکٹر ایم اے زرنگار نے اس کے بعض حصوں پر اعتراض کیا جو ان کے خیال میں:

"نہ صرف شر انگیز ہیں اور حقائق پر مبنی نہیں ہیں۔ بلکہ ایران، ایرانی حکومت اور سربراہ مملکت کے وقار کو ٹھیس پہنچاتے ہیں"۔(۱۶)

"دنیا مرے آگے" ترتیب دیتے وقت ابن انشاء نے:

"اپنی ذاتی دانست میں ایران و پاکستان کے بہترین روابط اور مصنف کو مزید پریشانی سے بچانے کی خاطر اس مضمون سے کچھ حصے حذف کردیئے اور چند فقرے اور سطریں بڑھادیں۔ تاکہ سفارت شہنشاہی ایران اور حکومت پاکستان کا عتاب دوبارہ نازل نہ ہو"۔(۱۷)

دوسرے ایڈیشن میں یہ باب اپنی اصلی حالت میں شائع ہوا جیسا کہ ۱۳۔ مئی ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں چھپا تھا۔ اس کی جانب عالی نے خود بھی توجہ دلائی ہے۔

"اب مضمون بالکل اپنی اصلی حالت میں شامل اشاعت ہے"۔(۱۸)

اس ایڈیشن میں ناشر نے "دوسری اشاعت" کے عنوان سے دو صفحات (۱۲، ۱۳) تحریر کئے اور "دہلی۔۔۔۔۔۔ایک شب" کے بعد سہ صفحات (۱۴۸ تا ۱۵۰) کا "پس تحریر" کے عنوان سے اضافہ کیا گیا۔ عالی نے ۱۹۸۲ء اور پھر ۱۹۸۴ء میں دلی کا سفر کیا۔ یہ تحریر ان سفروں کے بعد لکھی گئی۔ ان تین تبدیلیوں کے علاوہ دونوں کتابوں میں کوئی اور تبدیلی نہیں کی گئی۔ یہ اپنی اسی صورت میں اشاعت پذیر ہوئے جو اخباری کالموں میں موجود ہے۔

عالی نے ان کے علاوہ بھی کئی دوسرے ملکوں کے سفرنامے لکھے ہیں۔ جن میں سے "آئس لینڈ میں چند روز"، پندرہ روزہ "ملت"، اسلام آباد اور پھر شش ماہی "غالب" کراچی میں شائع ہوچکا ہے۔ پندرہ روزہ "ملت" سے اسے کئی ڈائجسٹوں نے بھی نقل کیا ہے۔(۱۹) اس کا دوسرا حصہ جو دو شہروں کے حالات پر مشتمل ہے، ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ آئس لینڈ کا سفر نامہ ان کے دیگر سفرناموں کی نسبت ان کی ذاتی اور شخصی زندگی کا خوبصورت حوالہ ہے۔ اس میں عالی کی تخلیقی شان عجب انداز سے جلوہ گر ہوئی ہے۔ بقول مختار زمن:

"آئس لینڈ کے بارے میں جمیل الدین عالی کا سفرنامہ اردو زبان میں پہلا سفرنامہ ہے۔ اس لئے مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔ شمالی یورپ کا یہ سرد ملک ہم اہل پاکستان کے لئے اتنا دور دراز معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق عام آدمیوں کی معلومات بہت کم ہیں۔ اگرچہ آج کل سفرنامے لکھنے کا فیشن عام ہو رہا ہے لیکن اکثر سفرنامے جانے پہچانے ملکوں کے بارے میں لکھے جارہے ہیں۔ آئس لینڈ کے برفستان کو اب تک کسی نے نہ چھوا تھا۔ عالی صاحب نے یہ کمی پوری کردی۔ اس لئے یہ سفرنامہ خاصے کی چیز ہے"۔(۲۰)

عالی نے چین کا سفرنامہ بھی لکھا تھا۔ لیکن وہ ۱۹۸۵ء میں بارشوں کی نذر ہوگیا۔ البتہ اس کے نوٹس محفوظ ہیں۔ یہ روزنامچہ کی صورت میں انگریزی اور اردو ہر دو زبانوں میں لکھے گئے ہیں۔ "دنیا مرے آگے" میں ناشر نے لکھا ہے کہ: "کچھ حصوں کے ترجے غیر زبانوں میں

ہوئے اور متعلقہ ممالک کے جرائد میں چھپے"۔(۲۱)

اس سلسلے میں راقم مقالہ نے استفسار کیا تو عالی نے لکھا۔

"میں نے سنا تھا کہ کچھ حصوں کے ترجمے روس، روس کی دوسری زبانوں اور جرمن میں ہوئے تھے۔ ۱۹۷۵ء میں ماسکو گیا تو وہاں کی انجمن ادباء نے ایک زیر ترجمہ حصہ دکھا کر کہا تھا یہ بھی چھپ رہا ہے (وہ حصہ عراق اور امریکہ سے متعلق تھا) مگر بعد میں انہوں نے اپنے وعدے کے باوجود کچھ بھیجا نہیں۔ انگریزی میں عراق، ایران اور جرمنی کا ترجمہ دو برس پہلے پروفیسر رالف رسل کے ایک شاگرد نے شروع کیا تھا۔ آگے کا مجھے علم نہیں"۔(۲۲)

۱۹۸۵ء میں زیادہ بارشوں کی وجہ سے ملیر میں بند ٹوٹ جانے سے پانی عالی کے گھر واقع ڈیفنس کالونی تک پھیل گیا۔ جس سے ان کی لائبریری کو کافی نقصان پہنچا۔ اس دورانیے میں ان کے اپنے تیرہ (غیر مطبوعہ) سفرنامے(۲۳) بھی ضائع ہوئے۔ انہوں نے اپنے ایک اظہاریے میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

(۳)

"عالی جس طرح کئی سطحوں پر زندگی کرتے ہیں۔ ویسے ہی ان کی تخلیقیت کا اظہار بھی کئی سطحوں پر ہوتا رہا ہے"۔(۲۴)

گویا عالی کی شخصیت خارج اور باطن کی آمیزش سے اظہار اور تحریر کی سطح پر رنگ و بو کی وسیع دنیا کو سموئے ہوئے ہے۔ حدیث ذات کا یہ عکس ان کی مختلف النوع جہتوں کا بیانیہ ہے۔ بادی النظر میں خارجی سطح پر، یہ جہتیں ایک بکھرے پن کی غماز ہیں۔ لیکن معنوی حوالے سے ان کی شخصیت ان کی شیرازہ بند ہے۔ شاعری میں غزل سے دوہے اور گیت سے قومی نغمے تک اور نثر میں شخصیت نگاری سے سفرنامے اور کالم نگاری سے مقدمہ نگاری تک کا ذہنی سفر ان کی اناپسندی کے ان تجل جذبوں کا منت پذیر ہے جو بیک وقت غالب کی نرگسیت اور درد کی بے نیازی سے حظ اٹھاتی ہے۔ ان میں جلال و جمال کی وہ وجدانی کیفیت نظر آتی ہے جو وجود معنوی میں ڈھل کر ابدیت سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ عالی کا کوئی بھی سفرنامہ اٹھا کر دیکھئے وہ دوران سفر کہیں بھی اپنی ذات کو گم نہیں کرتے۔ خارج کے سارے منظر ان کے باطن کا حصہ بنتے جاتے ہیں اور جب رچ بس کر نکلتے ہیں تو خوشبو کی طرح فضاؤں میں بکھر جاتے ہیں۔ منظر کا لفظوں کی خوشبو میں ڈھل کر صفحہ قرطاس پر بکھرنے کا عمل، پھول کے لئے کسی مسئلے کا باعث نہیں بنتا۔ کیونکہ خوشبو کی وسعت پذیری کے بعد بھی رنگ و نور کا جو مجموعہ رہ جاتا ہے۔ اس

کی اپنی قدروقیمت اور شناخت ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

"مشرق کے ایک خود نگر اور خوددار سیاح کی حیثیت میں مغرب کے مناظر حیات ان کے سامنے منفعل صورت میں آتے ہیں اور ان کی قدروقیمت محض اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ ان پر عالی التفات و عنایت کی نظر ڈال دیتے ہیں"۔(۲۵)

عالی کی شخصیت کا اپنا ایک تہذیبی پس منظر ہے جس کی وجہ سے ان کی شخصیت انفرادیت کی مظہر بھی ہے اور پہچان کا سبب بھی' اسی لئے وہ کہیں بھی دب کر نہیں رہتے۔ ان کی شخصیت انبوہ سیاحاں میں گم نہیں ہوتی۔ وہ ایئرپورٹ پر ہوں یا ماضی کے کسی گوشے میں' کسی سرکاری تقریب میں ہوں یا محفل مشاعرہ میں۔ وہ جہاں بھی ہوں اپنے ہونے کا احساس اور انداز رکھتے ہیں۔ ان کی خود پسندی کہیں کہیں تو نرگسیت کا روپ دھار لیتی ہے۔ لیکن اس میں بھی منفی انداز پیدا نہیں ہوتا بلکہ خاندانی وجاہت اور علمی و ادبی پس منظر سے ان کے اندر ایک ثقافتی اور تہذیبی حسن نمایاں ہوجاتا ہے۔ یہ رنگ جب ان کی تحریر میں در آتا ہے تو جاذبیت فکر کو ان تجربات سے آشنا کرتا ہے جو واردات روحانی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ اس طرح تحریر میں شخصی تاثر ابھر آتا ہے۔ اس لحاظ سے "آئس لینڈ میں چند روز" خاصے کی چیز ہے۔ جب بھی عالی شخصی زاویہ نظر سے اجتماعی فکری شعور سامنے لاتے ہیں' وہ اپنے معاصرین سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ مشاہدہ خارج سے وابستہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے اس تعلق سے بھی انکار ممکن نہیں جو اسے باطن سے ہم آہنگ رکھتا ہے۔ کیونکہ ہست بے رنگی اصول رنگ ہا..... کے پیش نظر یہ اسی جاذبیت فکر کا آئینہ دار ہے جو کثرت و وحدت کے باہمی تعلق سے سامنے آتی ہے۔ خارج میں رنگوں کی جو کثرت ہے وہ باطن کی بے رنگی کا مظہر ہے۔ کثرت و وحدت کی آمیزش اس متنوع فضا کی تخلیق کا محرک ہے جس سے ذوق تجسس نکھرتا اور تجربہ نئے اسلوب میں ڈھلتا ہے۔ عالی کے ہاں مناظر خارج سے باطن اور باطن سے خارج کی جانب مسلسل حرکت میں رہتے ہیں۔ اسی لئے وہ محض حال کے منظر نامے میں ہی سفر نہیں کرتے بلکہ بیک وقت ماضی کی جانب مراجعت اور مستقبل کی طرف پیش قدمی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ وہ تاریخ اور جغرافیہ کی معلوماتی سطح سے بہت نیچے گہرائی میں اتر جاتے ہیں' جہاں ندرت خیال انہیں یادوں کی دنیا میں پہنچادیتی ہے۔ صدیوں پرانا تمدن ان کا استقبال کرتا ہے۔ وہ تہذیبی وسعتوں میں ماضی کی بازیافت کرتے ہیں۔ کبھی وہ ابن خلکان اور طبری کا ہاتھ پکڑ کر تاریخ کی وادیوں میں پھرتے اور کبھی لمحات کے کھنڈرات سے حسن کی تجسیم

کے مناظر تراشتے ہیں۔ کبھی وہ زبیدہ کے محل میں جا پہنچتے ہیں اور کبھی ہارون الرشید کے شاہی دربار میں رونق افروز ہوجاتے ہیں۔ علماء کی مجالس انہیں اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ لائبریریاں انہیں ذہنی سکون کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ کہیں بھی ان کی قوت فکر کو تشنگی کا احساس نہیں ہونے پاتا۔ نقوش پارینہ میں ان کی محویت قابل داد ہے لیکن اس محویت میں بھی ان کی اپنی شخصیت چند لمحوں کے لئے بھی اوجھل نہیں ہوتی اور یہ سلسلہ لاشعوری طور پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ "آئس لینڈ میں چند روز" ان کی یادنگاری کے حوالے سے عذاب ماضی کا منظر نامہ بن جاتے ہیں جہاں کبھی تو وہ پلٹتے دنوں میں عمر رفتہ کو آواز دیتے اور کبھی کھوئے ہوؤں کی جستجو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جب وہ آتش رفتہ کا سراغ لگاتے ہیں تو ان کے سفرنامہ میں ایک گہری معنویت در آتی ہے۔ جو گہرائی اور گیرائی دونوں صفتوں سے مملو ہوتی ہے۔ اجتماعیت چونکہ انفرادیت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اس لئے انفرادی واردات یادنگاری کے عمل سے بڑھ کر اجتماعیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے تو وہ خود فرد کی سطح سے ابھر کر جماعت کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ وہ اسلاف کے کارنامے گنواتے اور شعوری سطح پر حال کے آئینے میں مستقبل کا عکس اتارتے ہیں۔ قومی دانش کا فروغ ان کا بنیادی موضوع ہے۔ وہ فکر کے موتی ڈھونڈتے اور اس مالا میں پرو دیتے ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے کہ "سچائی مومن کی میراث ہے جہاں سے ملے اسے پالو" تشکیل پاتی ہے۔ ان کے سفرناموں میں جہاں بھر کی "دانائی" سمٹ آتی ہے' اس لحاظ سے وہ ان سفرنامہ نگاروں سے ممتاز ہوجاتے ہیں' جن کا سفر محض کاروباری یا تفریحی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ ایک آدھ استثنیٰ کے علاوہ کون ہے جو ان کی ہمسری کرسکے۔ انہوں نے خارج کی مٹی کو داخلی نم سے گوندھ کر سفرنامے کی صورت دی ہے جس میں موسموں کے عکس و آہنگ در آئے ہیں۔ گوشہ چشم میں رنگوں کی نمائش اور دامن دل میں خوشبو کا احساس گلاب رتوں کی رعنائی کا ترجمان ہے۔ "دنیا مرے آگے" سے "آئس لینڈ میں چند روز" تک سارے سفرناموں میں جمال نسواں بکھرا ہوا ملتا ہے۔ مگر عالی ہے کہ کسی سے تسخیر نہیں ہوپاتا۔ ایک آدھ جگہ اس کا شائبہ گزرتا بھی ہے تو اگلے لمحے عالی محبوب بن چکا ہوتا ہے۔ ان سفرناموں کو پڑھتے ہوئے جہاں بھی عالی کا کردار ابھرا ہے مجھے سقراط یاد آجاتا ہے جو کسی بھی شخص کے عاشق کی حیثیت سے محبت کا آغاز کرتا لیکن بہت جلد محبوب بن بیٹھتا تھا۔ عالی عاشق ہے لیکن معشوق فریبی اس کا کام معلوم ہوتا ہے اور لیلیٰ اس کے آگے مجنوں کو برا کہتی سنائی دیتی ہے۔ وہ غالب و درد کے

حوالے سے دو مختلف روایتوں سے ابھرتا ہوا خوبصورت کردار ہے جو خارج میں بکھرے رنگوں کا تعاقب نہیں کرتا کیونکہ اس کی خود پسندی سے انکسار ذات کا جو احساس جنم لیتا ہے وہ اس بات سے آشنا ہے کہ جب خارج کے منظر باطن کے حسن سے ہم آغوش ہوتے ہیں تو فکری توازن اور فنی پختگی سے اظہار ذات کا نمایاں وصف بن جاتے ہیں۔ عالی مسلسل حرکت میں رہتا ہے اور کسی مقام پر بھی زیادہ دیر نہیں رکتا کیونکہ منظر اس کے اندر اترتے اور نئی منزلیں اسے خوش آمدید کہتی نظر آتی ہیں۔

"وہ کسی بھی مقام کو دل میں مستقل جگہ دینے کی بجائے اس کا حسن سمیٹتے ہیں اور شہد کی مکھی کی طرح اس کا جوہر کشید کرنے کے بعد کسی نئے گل شہر کی تلاش میں آگے نکل جاتے ہیں"۔(۲۶)

ان کے ہاں کہیں میر کے اس شعر

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

کے مصداق ہونٹوں کے زخم عکس صدا سے الجھتے اور کہیں غالب کے بقول دریاؤں کے طوفان انگیز دھارے ان کی انا پرستی کو خراج دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ دنیا کے تماشہ کو بازیچہ اطفال نہیں جانتے وہ زندگی کی قدروں کی صحیح اور سچی معرفت کا درک رکھتے ہیں۔ وہ جزئیات کے تانے بانے سے کلیات کا پیکر تراشتے اور سوز دروں دل سے لباس گل تیار کرتے نظر آتے ہیں۔ بات سے بات یوں پیدا کرتے ہیں جیسے سورج کی کرنیں کسی نگار خانے میں گھر گئی ہوں۔ اس طرح بعض جگہوں پر سفرنامے ایک دستاویز کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو متعلقہ ممالک کے تہذیبی و ثقافتی منظر نامے کو سمجھنے کے لئے معاون بن جاتے ہیں۔ عالی کے ہاں ایک ایسا تجسس پایا جاتا ہے جو پیش نظر مناظر کی داخلی سطح پر تحسین یا تردید کرتا ہے۔ محمود نظامی جن شہروں سے گزرتا ہے وہ شہر اس کے دل سے گزرتے ہیں لیکن عالی کے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ خیال کے تلازمے میں ایک طرح سے آزادہ روی پائی جاتی ہے جو ان کی قوت مشاہدہ کی نئے زاویے سے تعبیر کرتی ہے۔ وہ حقیقت کو شعوری طور پر بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ تاثر کی وحدت، واقعات کے عقب سے چہرہ نمائی کرتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے آئینہ خیال کی اس جلوہ نمائی کو جس خوبصورتی کے ساتھ اظہار کا رنگ بخشا ہے وہ ان کی تخلیقی اپچ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انہوں نے:

"ہر مقام اور منزل پر حقائق اور مناظر کا معروضی انداز میں جائزہ لیا ہے اور وہ بہت کم سنگ بستہ تعصبات کا شکار ہوتے ہیں۔ جہاں وہ آہنی پردے والی دنیا کی منافقتوں کا پردہ چاک کرتے ہیں، وہاں اس نام نہاد آزاد دنیا کی لنگڑی آزادی کا بھی مذاق اڑاتے ہیں"۔(۲۷)

عالی مغرب کے تہذیبی تضادات سے ان کے داخلی اور خارجی احساسات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ داخل و خارج کی باہمی کش مکش کے نتیجے میں پیدا شدہ حالات نے روحانیت کے مقابلے میں مادیت کو جنم دیا۔ عالی کا حقیقت پسندانہ رویہ ان کے مشاہدے کو دائمی قدروں سے روشناس کرتا ہے۔ وہ جب غازوں سے لتھڑی ہوئی صورتوں کے اصلی خدوخال سامنے لاتے ہیں تو ان کی بے باکی اور جرات اظہار کا پتہ چلتا ہے۔ وہ سود و زیاں سے بے پرواہ اپنی ترنگ میں مست، حق گوئی کا مظاہرہ کرتے جاتے ہیں۔ ان کا نرگسی مزاج انہیں مغربی ہتھکنڈوں کے آگے جھکنے نہیں دیتا۔ وہ امریکہ اور برطانیہ کو خیر اور برکت کا نمونہ نہیں جانتے۔ جیسا کہ ہمیں آج کے اکثر سفر نامہ نگاروں کے ہاں نظر آتا ہے۔ عالی ایک نظریاتی آدمی ہیں وہ اپنے نظریات موقع بے موقع دوسروں پر ٹھونستے نہیں لیکن ان کا برمحل اور برملا اظہار کردیتے ہیں۔ انہیں ملت اسلامیہ کی سیاست سے بطور خاص دلچسپی ہے۔ کشمیر اور فلسطین کے مسئلہ پر وہ اقوام متحدہ پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ انہیں اپنے ملک سے بے پناہ محبت ہے۔ اس کا اظہار ہر صفحے پر ہوتا ہے۔ پردیس میں وطن کی یاد خوشبو کا ہیولیٰ بن کر ان کا حصار کئے رکھتی ہے۔ ان کا وجدان انہیں خودنگری اور خود نگہداری کی گرفت سے باہر نہیں جانے دیتا۔ وطن انکے ہاں ماں کی محبت کا استعارہ ہے اور ماں کی محبت جب بڑھتی ہے تو کائنات اس میں سما جاتی ہے۔ ان کی تحریر سے اس کا یوں اظہار ہوتا ہے، جیسے بہار کے موسم میں گلاب سے کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ نثر اور نظم ہر دو میدانوں میں ان کی اس عقیدت کا اظہار ملتا ہے۔ یہ ان کے ایمان کا جزو ہے۔ پاکستانیت کا فروغ ان کا ہدف بھی ہے اور مشن بھی۔ دلی میں شب بھر کے قیام کے دوران ان پر جو گزرتی ہے اس کا عکس "ایک رات"(۲۸) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جب ۱۹۴۷ء کے واقعات ان کے شعور کے پردہ اسکرین پر ابھرتے ہیں تو سینکڑوں بے گناہوں کی تڑپتی لاشیں منظر کو سوگوار کردیتی ہیں۔ ان کے خیال میں میرو غالب کی دلی چند ثانیوں کے لئے ابھر آتی ہے جو عالم میں انتخاب تھی اور جس کے کوچے اوراق مصور تھے لیکن اس سانحہ کے بعد وہی دلی ان کے لئے کسی خوش کن منظر کا پیش نامہ نہیں بن پاتی۔ وہ اس سرزمین سے نفرت تو نہیں کرتے لیکن اپنے دل میں اس کے لئے دل بستگی کا کوئی سامان بھی نہیں پاتے۔ وہ سکھ اور ہندو

کے معاملے میں متعصب نہیں، وہ سچائی اور صداقت کے پجاری ہیں لیکن ظلم جہاں بھی ہو اور جس رنگ میں بھی ہو، وہ اس کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔

"مجھے آج کے دلی والوں سے کوئی عناد نہیں، کوئی پرخاش نہیں، وہ بھی مجھ جیسے عام آدمی ہیں اور ان کی اکثریت بھی بے گناہ سکھ ہندو مہاجرین پر مشتمل ہے۔ مگر میں دلی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ میرے باپ کی جاگیر نہ سہی مگر ہندوستان میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کا ورثہ ضرور ہے۔ جو ہم سے، مجھ سے چھین لیا گیا ہے۔ یہ بائیس خواجہ کی چوکھٹ اب ایک متعصب قوت کے پاؤں تلے روندی جا رہی ہے جو ہر اس چیز کو مٹانے پر تل گئی ہے جس پر کسی قسم کے اسلامی رشتے کی چھاپ ہو۔ ہاں بھائی میں دلی کا سفرنامہ نہیں لکھ سکتا۔ میرا احساس بہت تلخ ہو چکا ہے اور میرا رہا سہا علم تلخی کی آنچ پر پگھل کر ہوا ہو گیا ہے"۔(۲۹)

دلی عالی کی جنم بھومی ہے۔ وہ اس کے گلی کوچے سے شناسا ہے۔ اس شہر میں یہاں وہاں ان کا تہذیبی پس منظر بکھرا ہوا ہے۔ ان کی ذاتی زندگی کے توسط سے بھی یہ شہر ان کے خوابوں کا مسکن رہا ہے لیکن پندرہ سال بعد جب وہ دلی میں ایک شب کے لئے مہمان ٹھہرتے ہیں تو ان کی دینی حمیت اور پاکستانیت انہیں آرام سے نہیں رہنے دیتی۔ اس اضطرابی کیفیت میں دلی کا ماحول ان کے لئے اجنبیت کا حوالہ بن جاتا ہے۔

"میں کھرا دلی والا ہوں۔ وہیں پیدا ہوا اور وہیں پروان چڑھا۔ مگر آج میں اس آغوش مادر جیسے شہر میں اجنبی اور گھبرایا ہوا سا ہوں۔ کیونکہ آج یہاں میرے نئے وطن کے خلاف منصوبے بندھتے ہیں۔ مجھے اور میرے بچوں کو مفلوج کر دینے کی سازشیں ہوتی ہیں۔ آج دلی کی راج دھانی پاکستان دشمنی کا سب سے بڑا مرکز بنی ہوئی ہے"۔(۳۰)

اس بیگانے اور اجنبی ماحول میں وطن کی باس ان کے مشام جان کو معطر کرتی ہے۔ پاکستان ان کی پہچان بھی ہے اور شناخت بھی۔ پاکستان صداقت کا مظہر ہے یہ سچائی ان آفاقی قدروں سے ترکیب پاتی ہے جو محمد عربیؐ کے ارفع و اعلیٰ پیغام سے عبارت ہیں۔ عالی کے سفرناموں میں وہ حصے بطور خاص دیکھنے کے لائق ہیں جن میں وطن کی خوشبو کا جذب و کیف جھلکارے لیتا ہے۔ آزادی کا سلسلہ زندگی کی ان کڑیوں سے مربوط ہے۔ جن کے بغیر خود زندگی کا تصور ہی خیالِ خام ہے۔ لباس، زبان اور وطن کی آزادی تابناک اور اطمینان بخش مستقبل کی ضمانت ہے۔ دلی کی اجنبی فضا میں:

"مجھے پاکستان ایک جنت کی طرح نظر آ رہا ہے۔ جہاں میں اپنے نام، اپنی زبان اور اپنے

ایمان کی کھلی آزادی برقرار رکھ سکتا ہوں۔ پاکستان جو میری پناہ گاہ ہے جو میرا گھر ہے' میرا وطن ہے' جس نے مجھے اور میری نسلوں کو ایک حال اور ایک مستقبل کی ضمانت دے رکھی ہے اور جو ایک عظیم نصب العین' ایک عظیم منزل' ایک عظیم میدان کار ہے"۔(۳۱)

وطن کی محبت سے عالی کے ہاں وہ معاشرتی شعور در آیا ہے جو معاشرتی اور سماجی تضادات کا مطالعہ کئی سطحوں پر کرنے میں معاونت کرتا ہے۔ وہ کئی جگہوں پر معاشرتی ناہمواریوں پر طنز کے نشتر چلاتے ہیں۔ اس میں بھی پس پردہ اصلاح اور ہمدردی کا پہلو کارفرما ہوتا ہے لیکن یہ جس انداز سے سامنے آتا ہے اس سے کئی چہروں پر شکنیں نمودار ہوجاتی ہیں۔ لیکن عالی اس کی پروا کئے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ طنز ایک طرح سے الیاتی فضا میں جنم لیتا ہے لیکن اس میں یاسیت اور قنوطیت کا عنصر پیدا نہیں ہوتا بلکہ مثبت انداز فکر کا نمائندہ بن کر رجائی طرز عمل کا داعی ٹھہرتا ہے۔ ان کے طنز میں کسی قسم کی گھٹن پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایک طرح سے تازگی کا احساس بڑھ جاتا ہے اور ان کی رعنائی فکر خارجی ماحول میں ہلکے پھلکے مزاح کی جانب پیش قدمی شروع کردیتی ہے۔ عالی مزاجاً مصلح واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں یہ رنگ کئی جہتوں میں نظر آتا ہے' طنز ان میں سے ایک ہے۔ اگر ان کے سفرناموں سے طنزیہ حصوں کو الگ کرلیا جائے تو اچھا خاصا مجموعہ ترتیب پا سکتا ہے۔ چند مثالیں:

"عام طور پر لوگ دوسرے سے اپنی زبان کا ایک لفظ بھی سن کر خوش ہوجاتے ہیں۔ سوائے اپنے پیارے وطن کے جہاں اب بھی اونچی سوسائٹی میں السلام علیکم کہنا جہالت اور مفلسی یا کم از کم گھٹیا پن کی علامت سمجھا جاتا ہے"۔(۳۲)

"ظاہر ہے کہ اپنی زبان (پاکستانیوں کے سوا) سب انسانوں کی سب سے بڑی کمزوری' سب سے بڑی قوت ہوتی ہے"۔(۳۳)

"حاکم اور افسر خواہ رعایا کے ساتھ دوسری کتنی ہی ناانصافیاں کرتے ہوں مگر کسی کو اپنی قومی زبان بولنے کی بنا پر حقیر اور ذلیل نہیں گردانتے"۔(۳۴)

ایسی مثالیں ان کی تحریروں میں بہت ہیں طنز و مزاح کی آمیزش سفرنامے کو گہری سنجیدگی سے بچاتی ہے۔ کیونکہ حد درجہ گہری سنجیدگی بوجھل پن کا باعث بن جاتی ہے۔

عالی کا مشاہداتی کینوس بہت وسیع ہے اس پر ان کی تخلیق' اظہار کی عجیب و غریب بوقلمونی کا عکس نامہ ہے اسی لئے تاریخ اور جغرافیے کے منظرنامے پر ان کے تاثرات سفر بعد میں آنے والے سفرنامہ نگاروں سے علیحدہ پہچان رکھتے ہیں۔ جن سفرنامہ نگاروں نے اپنے سفر کا

بیانیہ خارج کی دنیا سے ہٹا کر خواب و خیال کے نگار خانے میں سجایا ہے ان کے ہاں افسانوی رنگ کی چھاپ بہت گہری ہو گئی ہے۔ سفرنامہ نگاروں نے ڈرامائی انداز سے کام لیا ہے لیکن عالی اور محمود نظامی ان میں شامل ہوتے ہوئے بھی علیحدہ دکھائی دیتے ہیں۔ واقعیت کی سطح پر کوئی بھی ان دونوں کا حریف نہیں۔ محمود نظامی نے بھی فلیش بیک کے ڈرامائی انداز سے بہت حظ اٹھایا ہے۔ اس کے سفرناموں میں دو سطحوں کا اظہار ایک ساتھ وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ ایک سفر اس کے باطن میں جاری ہے اور دوسرا باطن و خارج کی آمیزش سے ایک نئی جہت کا راہی ہے عالی کے ہاں اس اظہاریے کا بیان دوہری سطح پر تو نہیں ہوتا لیکن اس اظہار کی لہر اس قدر زوردار اور متوازن ہے کہ اس سے فکر و عمل کی سنجیدگی خارجی حوالوں سے کائنات شناسی کے سلسلے میں ایک شعوری کوشش بن جاتی ہے۔ یہ زاویہ نظر بہت اہمیت کا حامل ٹھہرتا ہے کیونکہ جب مشاہدہ' حقیقت کے زیر اثر تاثر کی صورت میں ڈھلتا ہے تو پھیلتے ہوئے کسی سفرنامے کا منظر نامہ بن جاتا ہے۔

(۴)

سفرنامے کے زرین دور میں عالی کا سفرنامہ ایک خاص سمت اور جہت کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے سفرنامے کو نہ تو افسانوی رنگ دیا اور نہ ہی اسے خشک معلومات کا مجموعہ بنانے کی سعی کی:

"انہوں نے سفرنامے کو سفرنامہ ہی رہنے دیا"۔(۳۵)

البتہ بقول ڈاکٹر انور سدید:

"سفرنامے میں غزل کی شعوری روایت کو شامل کرنے کی کوشش کی"۔(۳۶)

جس سے انہوں نے خارج اور باطن کے باہمی امتزاج سے مشاہدے کے کینوس پر وہ منظر ابھارے جو تلاش ذات کے سلسلے میں ان کے ممد ہوئے ہیں۔ سفرنامے کی بنت میں ماضی اور مستقبل کے ارتکاز سے لمحہ موجود کی شناخت ان کا خاص وصف ہے۔ انہوں نے تہذیبی پس منظر میں زندگی کو موضوعی اور معروضی ہر دو حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح ان کے ہاں مشاہدے کی بوقلمونی سے اجتماعی اور یاد ماضی کی بازیافت سے انفرادی پہلو سامنے آیا ہے۔ ان کا مشرقی پن اپنی روایات سے منحرف نہیں ہوتا۔ وہ تاریخی شعور کی بدولت انسان شناسی کا شعور پا لیتے ہیں۔ جس سے ان کے ہاں خبر اور نظر میں توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ جو ان کے سفرنامے کی متنوع فضا کی تخلیق کرتا ہے۔ ان کے سفرناموں میں تازگی اور

رعنائی کا احساس ملتا ہے جس سے اثر آفرینی کے منظر تخلیق ہوتے جاتے ہیں۔ وہ جمالیاتی مناظر سے حظ اٹھاتے ہیں۔ ان کی تصویر کشی کرتے اور یادوں کو نکھارتے چلے جاتے ہیں۔ اس سے سفرنامے کے بہاؤ میں ایک چاشنی پیدا ہوجاتی ہے۔ بعض مقامات پر وہ جذباتی کیفیات سے کیف گیر ہوجاتے ہیں۔ خاص کر جب وہ حضرت امام حسینؓ کے روضۂ اطہر پر حاضری دیتے ہیں تو ان کے جذب و کیف میں ایک سرمدی تاثر کا گمان گزرتا ہے۔ ایسے وجدانی لمحات میں وہ زمان و مکان کو نئی معنویت سے آشنا کرتے اور لطافت فکر کے دھاروں کو نئی سمت میں رواں دواں رکھتے ہیں۔ ان کے مناظر بہت جاندار اور متحرک ہیں۔ وہ کسی بھی ملک کے بارے میں پہلے سے مفروضات قائم نہیں کرتے اور نہ ہی پہلے سے بنائے گئے خاکوں میں رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ ان کی حس ادراک اس قدر تیز ہے کہ وہ کسی منظر سے بھی چشم پوشی نہیں کرتی۔ ان کی تحریر معلومات سے پر ہوتی ہے اس میں تاریخ کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے اور جغرافیائی حوالے بھی آتے ہیں لیکن وہ کسی بھی جگہ اپنے قاری کو ناگواری یا بے قراری کا شکار نہیں ہونے دیتے۔ سینکڑوں اشعار اور مصرعے ان کے نوک قلم پر ہوتے ہیں جو موقع و محل کی مناسبت سے تحریر میں جگہ پاتے ہیں۔ ان کے ہاں تخلیقی عمل کی تیز رو لہر تمام خارجی مناظر داخلیت سے ملا کر شیر و شکر کررہی ہے۔ کہیں بھی معیار میں کمی نہیں آتی۔ ربط وضبط کا خاص اہتمام موجود ہے لیکن اس میں بناوٹ اور تصنع کا عمل دخل نہیں۔ ایک ندی ہے جو رواں دواں ہے۔ اس کا پھیلاؤ میدانوں کو محیط ہے۔ اس میں ایک قدرتی ٹھہراؤ پایا جاتا ہے۔ کوہسار کے دامن میں بہتی ندی کا سا شور نہیں۔

حواشی :

۱۔ سید عبدالقادر جیلانی، غنیتہ الطالبین، ص ۸۸۴، مطبع اسلامیہ لاہور، ۱۳۳۲ھ

۲۔ ڈاکٹر انور سدید۔ اردو ادب میں سفرنامہ، ص ۶۳، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور

۳۔ مولوی فیروز الدین (مترجم) کشف المحجوب، ص ۲۶۸، س۔ن

۴۔ مسعود حسن شہاب، حرف آغاز، ص ۸، سہ ماہی الزبیر، سفرنامہ نمبر، اردو اکادمی بہاولپور، ۱۹۶۴ء

۵۔ رحمن مذنب، اردو میں سفرنامہ، ص ۳۰۶، ماہنامہ اوراق، خاص نمبر، جون/جولائی ۱۹۸۸ء

۶۔ ڈاکٹر وحید قریشی، عرض ناشر، ص ۵، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، بار اول ۱۹۸۷ء

۷۔ ڈاکٹر مظفر عباس، پیش لفظ، ص ۲، یوسف خان کمبل پوش، عجائبات فرنگ، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۲ء

۸۔ یوسف کمبل پوش کے "عجائبات فرنگ" کو اردو کا پہلا سفرنامہ بتایا گیا ہے۔ یہ اب سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے ۱۸۴۷ء میں پہلی بار چھپا۔

۹۔ نصیر الدین نصیر' تقریظ' ص ۲۰' حافظ لدھیانوی' جمال حرمین' جنگ پبلشرز' لاہور' بار اول دسمبر ۱۹۸۹ء

۱۰۔ ڈاکٹر انور سدید' جمیل الدین عالی کے سفرنامے' ص ۲۱۳' ایم۔ حبیب خان' جمیل الدین عالی۔ فن اور شخصیت' علمی مجلس' دہلی' بار اول ۱۹۸۸ء

۱۱۔ فیاض اعوان کا جمیل الدین عالی سے انٹرویو۔ ص ۲۵' ماہنامہ خوبصورت' کراچی' جولائی ۱۹۹۱ء

۱۲۔ شبیر علی کاظمی' عالی کا نظریہ نگارش' ص ۶۴' ایم۔ حبیب خان' جمیل الدین عالی۔ فن اور شخصیت

۱۳۔ عرض ناشر' ص ۸' جمیل الدین عالی۔ دنیا مرے آگے' شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور۔ ۱۹۸۴ء

۱۴۔ دنیا مرے آگے' میں ناشر نے سن اشاعت ۱۹۷۴ء لکھا ہے جب کہ ضابطہ اشاعت میں ۱۹۷۵ء درج ہے۔ اس تفاوت پر راقم نے استفسار کیا تو عالی صاحب نے یوں وضاحت کی "اشاعت کی تیاری ۱۹۷۴ء میں ہوئی اور اشاعت ۱۹۷۵ء میں" (مکتوب عالی بنام راقم الحروف' مورخہ ۲۳۔ ستمبر ۱۹۹۱ء)

۱۵۔ عالی میرے آگے' ص ۱۶' جمیل الدین عالی' دنیا مرے آگے

۱۶۔ روزنامہ جنگ' کراچی' ۲۹۔ مئی ۱۹۹۳ء' ص ۴

۱۷۔ جمیل الدین عالی' دنیا مرے آگے' ص ۲۴

۱۸۔ جمیل الدین عالی' دنیا مرے آگے۔ ص ۲۴

۱۹۔ مکتوب عالی بنام راقم الحروف' بتاریخ ۲۳۔ ستمبر ۱۹۹۱ء

۲۰۔ اداریہ۔ ص ۶' شش ماہی "غالب" کراچی' جولائی تا دسمبر ۱۹۸۸ء (مشترکہ شمارہ) جنوری تا دسمبر ۱۹۸۹ء

۲۱۔ عرض ناشر' ص ۸' جمیل الدین عالی' دنیا مرے آگے

۲۲۔ جمیل الدین عالی کا خط مورخہ ۲۳۔ ستمبر ۱۹۹۱ء بنام راقم

۲۳۔ جمل الدین عالی سے راقم کی ملاقات' یکم۔ دسمبر ۱۹۹۱ء' کراچی

۲۴۔ گوپی چند نارنگ' عالی جی کے من کی آگ' ص ۳۶۹' ایم۔ حبیب خان' جمیل الدین عالی: فن اور شخصیت

۲۵۔ اردو ادب میں سفرنامہ' ص ۳۵۲

۲۶۔ ڈاکٹر انور سدید' اردو ادب میں سفرنامہ' ص ۳۵۲

۲۷۔ کچھ سفرناموں کے حوالے سے' تحسین فراقی' ص ۸۰۰' بحوالہ تخلیقی ادب (۳) اکتوبر' نومبر ۱۹۸۳ء

۲۸۔ جمیل الدین عالی' دنیا مرے آگے' ص ۱۴۳

۲۹۔ جمیل الدین عالی' دنیا مرے آگے' ص ۱۴۷' شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور' بار دوم ۱۹۸۴ء

۳۰۔ جمیل الدین عالی' دنیا مرے آگے' ص ۱۴۴' شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور' بار دوم ۱۹۸۴ء

۳۱۔ جمیل الدین عالی' دنیا مرے آگے' ص ۱۴۷

۳۲۔ جمیل الدین عالی' تماشا مرے آگے' ص ۳۳

۳۳۔ جمیل الدین عالی' تماشا مرے آگے' ص ۴۲

۳۴۔ جمیل الدین عالی' دنیا مرے آگے' ص ۲۸

۳۵۔ مشفق خواجہ' مقدمہ' ص ۱۴' جمیل الدین عالی' حرفِ چند

۳۶۔ سفرنامہ' ص ۱۲۸' تخلیقی ادب (۲)' کراچی

عالی اور اظہاریہ نگاری کی روایت

(۱)

"شعری ادب میں کئی صنفیں شامل ہوتی رہی ہیں۔ بعض ابتداء میں قبول نہیں ہوتیں مگر جن میں جان ہوتی ہے وہ اپنی جگہ بنا لیتی ہیں۔ اردو نثر میں بھی طرح طرح کی اصناف داخل ہوئیں۔ داستان گوئی سے سرسید کی مقالہ نویسی' پھر ناول' پھر افسانے' پھر انشائیے۔ انشائیے کیا ہیں؟ اور کس نے شروع کئے؟ اس موضوع پر بھی بحثیں جاری ہیں بلکہ اسی موضوع پر انشائیے لکھے جا رہے ہیں۔

میں بائیس برس سے باقاعدہ نثر لکھ رہا ہوں اور ایک صنف مجھ جیسوں نے بھی متعارف کر دی ہے۔ بظاہر باقاعدہ کالم ہیں------ جو مروجہ صحافتی معیار و اقدار کے مطابق کالم نہیں ہوتے یعنی ان میں طنز و مزاح نہیں ہوتا۔ سیاسی موضوعات نہیں ہوتے' لازماً حالات حاضرہ سے بھی تعلق نہیں رکھتے' بس اظہاریئے ہوتے ہیں------ یعنی مجھ جیسے جو سوچتے ہیں وہ کم اشاعت ماہناموں کے بجائے روزناموں کے ہفتہ وار میگزین کو بھیج دیتے ہیں تاکہ ہماری بات زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچ جائے۔

ہم میں کچھ باقاعدہ اظہاریہ نویس شامل ہیں' کچھ بے قاعدہ۔ یہ اظہاریے زیادہ تر فکری ہوتے ہیں۔ سیاسی موضوعات کو چھوڑ کر جو ہماری حدود سے باہر ہیں۔ سماجی' علمی' سائنسی' ادبی مسائل پر اظہار خیال------ یہ صنف اس لئے پیدا ہوئی کہ ادبی ہفتہ وار اور ماہانہ جریدے بند اور کم ہوتے گئے' پھر اچھے جرائد کے صرف سالنامے آنے لگے بلکہ اب تو بعض جریدے دو دو تین تین برس بعد آتے ہیں۔ اتنے دن کون اپنے فکری اظہار کو دبائے بیٹھا رہے۔ چنانچہ کئی وہ لوگ جو میری طرح کارکن صحافی نہیں اور جو صحافیانہ انداز کی تحریر لکھنے پر بھی قادر نہیں' مگر اپنے فکری مشن کے دباؤ میں اظہار پر مجبور ہیں------ میرے یہ "کالم" مروجہ محاورے میں کالم نہیں' ادب کی ایک صنف ہیں۔ ادب کیا ہوتا ہے؟ اس کی کوئی جامع'

محدود، واضح تعریف آج تک تو ہو نہیں سکی ہے۔ ہاں اصغر گونڈوی کا ایک شعر اس کو کسی حد تک Define کرتا ہے:

سنتا ہوں بڑے شوق سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرز ادا ہے

میں سیاست پر تو لکھتا ہی نہیں، دوسرے موضوعات بھی متعین نہیں ہیں۔ ہمارے اظہاریوں کا مخزن کیا ہے؟ پاکستان کے ماضی، حال اور مستقبل سے ہمارا عشق، ہماری آمیزش، ہماری خوش تمنائی"۔(۱)

(۲)

عالی کی نثر نگاری کا آغاز خاکہ نویسی سے ہوا۔ ان کا ایک دوسرا امتیاز ان کا سفرنامہ ہے۔ یہ ۱۹۶۳ء سے روزنامہ جنگ کے سنڈے ایڈیشن میں چھپنا شروع ہوا اور ۱۹۶٦ء تک مسلسل چھپتا رہا بعد میں انہیں یہ سلسلہ بوجوہ ختم کرنا پڑا۔ کیوں کہ جب وہ پریس ٹرسٹ کے سیکرٹری ہوئے تو ٹرسٹ کے:

"چیئرمین جناب اے کے سومار مرحوم کہتے تھے۔ آپ ہمارے ہاں انجام، امروز یا مشرق میں لکھیے۔ آپ ملازم ہمارے ہاں ہیں اور لکھتے جنگ میں ہیں۔ میں کہتا کہ میں پہلے سے جنگ میں کمیٹڈ ہوں۔ لیکن وہ نہ مانتے، اس طرح جھگڑے ہوئے تو میں نے آخر تنگ آکر (لکھنا) بند کردیا۔

اس کے بعد میں نے پریس ٹرسٹ سے استعفیٰ دے دیا اور میں لندن چلا گیا اور واپسی ۱۹٦۷ء میں ہوئی۔ جنگ والوں نے کہا، "اچھا اب کچھ لکھیے" میں نے کہا "کیا لکھوں" انہوں نے کہا "جو مرضی لکھیے۔ تاثرات، اظہاریہ کچھ بھی" چنانچہ میں نے اس طرح لکھنا شروع کیا۔ یہ ۱۹٦۷ء کی بات ہے اور تب سے اب تک یہ "اظہاریہ" چل رہا ہے"۔(۲)

اظہاریہ جیسے کہ پہلے لکھا جا چکا، خاص جمیل الدین عالی کی اپنی صنف اظہار ہے جو انہوں نے حلقۂ ادب میں متعارف کروائی ہے۔ یہ کالم کی طرز کی تحریر تو ہے لیکن معروف معنوں میں کالم نہیں۔ کیوں کہ خود عالی صاحب کے بقول:

"میں جو لکھ رہا ہوں اور (سالہا سال) سے لکھ رہا ہوں۔ سچی بات ہے میں اسے کالم نہیں مانتا ہوں بلکہ اسے اپنا "اظہاریہ" کہتا ہوں"۔(۳)

"اظہاریے" اور "کالم نگاری" میں کون سی قدریں مشترک ہیں؟ اور اگر ان میں

تفاوت ہے تو کیا ہے؟------ ان سوالات کے جواب تلاش کرنے سے پیشتر یہ دیکھنا زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "کالم" اور "ادب" کا جو باہمی منظرنامہ تشکیل پاتا ہے اس کی حدود کیا ہیں؟------ اس سلسلے میں فکر تونسوی کا یہ قول پڑھنے کی چیز ہے:

"کالم نگاری کا ایک المیہ یہ ہے کہ جرنلزم کے سربراہ اسے صحیح جرنلزم شمار نہیں کرتے اور ادبی سربراہ اسے ادب کی ذیل میں نہیں آنے دیتے۔ یہ ایک عجیب مضحکہ خیز حقیقت ہے کہ جن ادیبوں نے ادبِ عالیہ تخلیق کیا انہیں تو مسلمہ فن کار تسلیم کیا جاتا ہے لیکن انہی مسلمہ فن کاروں نے کالم نگاری بھی فرمائی ہے تو اسے اہلِ بینش (مجھے نقادوں کو ہی مجبوراً اہلِ بینش کہنا پڑتا ہے) ادب ماننے سے کتراتے رہے"۔(۴)

دوسری طرف کالم نویسوں نے سیاست کی جگہ الزام تراشی، طنزومزاح کی جگہ لطیفہ گوئی اور علمی و ادبی ماحول کے بجائے بے علمی کی جو فضائی بنائی ہے۔ اس نے کالم نگاری کی اعلیٰ روایت کو مجروح کیا۔ اگر 'اظہاریے کے عصری منظرنامے پر ابن الحسن' انتظار حسین' مشفق خواجہ' میرزا ادیب' ابن انشاء' فکر تونسوی' عطاء الحق قاسمی اور جمیل الدین عالی کے نام نہ ابھرے ہوتے تو خدا معلوم اب اس صنف کا کیا حال ہوتا------ عالی کے اظہاریوں کو ان کی موضوعاتی ہمہ جہتی' فکری ہمہ گیری اور اسلوبِ اظہار کے حوالے سے ایک ہی نظر میں علیحدہ شناخت کیا جا سکتا ہے۔ موضوعاتی ہمہ گیری اور اظہار کی توانائی کا جتنا خوب صورت تال میل عالی کے ہاں ہوا ہے' اس کی کوئی دوسری مثال آسانی سے تلاش کرنا ممکن نہیں۔

(۳)

جمیل الدین عالی کی اظہاریہ نویسی کا آغاز ۱۹۶۷ء میں ہوا۔ ۱۹۷۸ء تک کے گیارہ سالہ اظہاریوں کا انتخاب دو مجموعوں کی صورت میں شائع ہوا:

۱۔ صدا کر چلے (ضخامت ۶۳۰ صفحات)(۵)

۲۔ دعا کر چلے (ضخامت ۵۸۴ صفحات)(۶)

"صدا کر چلے" کا انتساب نورالحسن جعفری اور "دعا کر چلے" کا انتساب محمد عمر کے نام ہے:

ع "دوست آن باشد کہ گیرد دستِ دوست"

"صدا کر چلے" میں اکیاسی (۸۱) اظہاریے اور پانچ اقتباسات شامل ہیں۔ انہیں بہ تفصیلِ ذیل بارہ مختلف موضوعات میں تقسیم کیا گیا ہے:

موضوعات	اظہاریوں کی تعداد
۱۔ کامیابی کا مفہوم	(۶)
۲۔ مفادِ پیوستہ	(۸)
۳۔ روشن امکانات	(۵)
۴۔ بیگانگی کا مسئلہ	(۲)
۵۔ جہیز کا مسئلہ	(۴)
۶۔ ثقافتی دیوارِ چین	(۷)
۷۔ ایک قرآنی مسئلہ	(۲)
۸۔ پاکستانی قومیت اور یک جہتی (۱)	(۴)
۹۔ پاکستانی قومیت اور یک جہتی (۲)	(۹)
۱۰۔ ادبی افق	(۱۳)
۱۱۔ اے آرزو خرامی	(۲۱)
میزان	۸۱
۱۲۔ اقتباسات	(۵)

کتاب کے آغاز میں ناشر (سید عاصم محمود) کا بائیس صفحات کا مقدمہ ہے۔ جس میں عالی کی اظہاریہ نویسی اور ادبی خدمات کے حوالے سے یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح کالم نگاری کی روایت انکی علمی اور ادبی زندگی کے فکری پہلوؤں سے آشنا ہوئی ہے۔ عالی کے افکار اپنے جدلیاتی کینوس میں بکھر کر جب تخلیقی تجربے کی معنوی اکائی سے مملو ہوتے ہیں تو انکے نظریات کی اجتماعی افادیت کا عکس اس حسنِ عمل میں ڈھلنے لگتا ہے جو احساس کی لاشعوری قوتوں کا محرک ہے۔ اس سے تہذیبی پس منظر کی روایت، مستقبل کے لئے حسین آرزوؤں کی رجحان ساز فکر کا لباس اوڑھ لیتی ہے جو مشرق و مغرب کی دانش کا کلیدی ارتباط ہے۔ اس نکتے کی صورت گری اس وقت مکمل ہوتی ہے جب تخلیق کا عمل ذہن کے مخفی شعور کا عرفان حاصل کر لے اور یہ مقام اپنی ذات کی مختلف سمتوں میں سفر کئے بغیر ممکن نہیں۔ کیوں کہ کائنات کے تناظر میں تصورِ ذات کا حسی تجزیہ وجدان کی اس کلی معرفت کا بیانیہ ہی نہیں، شخصی احساس کی فکری کیفیت کا عکاس بھی ہے۔ "صدا کر چلے" کے اس حصہ کو، جو پاکستانی قومیت اور یکجہتی سے متعلق ہے "دعا کر چلے" کے منظرِ پاکستان کی معنوی صداقت سے ملا کر پڑھیے ——

اور اس مہک کی دل بستگی کے منظر کو محسوس کیجئے جو حصارِ ذات کے عمل سے گزر کر روح کی متنوع جہتوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

(۴)

"دعا کر چلے" کی ضخامت پانچ سو چوراسی صفحات ہے۔ ناشر کی نو صفحاتی گزارشات کے علاوہ "صدا کر چلے" کا مقدمہ بھی اس کے آخر میں دیا گیا ہے۔ کیوں کہ بقولِ ناشر:

"ہم نے (اس مقدمے کو) اس لئے بجنسٖہ اس جلد کے آخر میں شامل کر دیا ہے تاکہ اس کی بہت سی باتوں کو ہمیں نہ دھرانا پڑے"۔

(دعا کر چلے، ۱۹۸۴ء، ص ۹)

"دعا کر چلے" اڑسٹھ اظہاریوں پر مشتمل ہے جنہیں آٹھ موضوعات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے:

موضوع وار تقسیم:	اظہاریوں کی تعداد:
۱۔ منظر نامہ پاکستان	(۱۵)
۲۔ نرمی و گرمی نفس	(۱۸)
۳۔ کچھ عالمی افق سے	(۹)
۴۔ شخصیات	(۱۷)
۵۔ کیا گورے کیا کالے	(۳)
۶۔ سیاحت	(۲)
۷۔ فکر و نظر	(۱)
۸۔ متفرقات	(۳)
میزان =	۶۸

یہ مجموعہ حال کے منظر نامے پر آنے والی صبح (کل) کو منعطف کر رہا ہے۔ تہذیبی پس منظر میں عصری شعور کی محسوساتی کش مکش معاشرے کے ان نہاں خانوں کا تصویری منظر ہے جو زندگی کی قدروں کے واقعاتی پیش نامے کو امکانی ارتقاء کا پرتو گردانتا ہے۔ یہ بین الاقوامی سطح پر اپنے تہذیبی عوامل کے عناصر ترکیبی کی مشاہداتی توضیح ہی نہیں عملی توجیہ بھی ہے۔

"دعا کر چلے" اپنے موضوعاتی اور فکری عرفیت کے حوالے سے فکرِ عالی کا اہم ماخذ ہے۔ خاص طور پر ان کی پاکستانیت کے سلسلے میں اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ناشر کی شہادت کے مطابق جمیل الدین عالی کے یہ کالم ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۷ء تک کے ہیں----- اور اس عرصے کے بھی یہ عالی کے کل اظہاریے نہیں ہیں' ان کا محض ایک انتخاب ہے جسے عالی کے دو احباب فرہاد زیدی اور جمال پانی پتی نے کیا ہے۔ یہ منتخب کالم بھی پورے کے پورے نہیں لئے گئے' صرف موضوعاتی انتخاب پر اکتفا کیا گیا ہے یعنی بعض موضوعات کے تحت ان کے مختلف کالموں سے ان کے افکار کو چن لیا گیا ہے------ مختلف اظہاریوں کے آخر میں تاریخِ طباعت دے دی گئی۔ یہ ایک بہت اچھی بات ہے' اس سے اصل متن کی طرف مراجعت آسان ہو گئی ہے۔

ناشر نے ٹھیک کہا ہے:

"کاش یہ کالم پورے کے پورے شائع ہو سکتے۔ کیوں کہ عالی صاحب کا اپنا ایک انداز اظہار ہوتا ہے۔ وہ شروع کچھ دلچسپ فقروں سے کرتے ہیں اور ایک خاص اسٹائل سے گھوم کر مطلب پر آجاتے ہیں۔ بیک وقت کئی موضوعات بھی لے لیتے ہیں۔ بہت سی باتیں ہلکے پھلکے انداز سے ملا جلا کر کہہ جاتے ہیں۔ انگریزی' اردو فارسی کلاسک اور عصری ادب سے شعر بھی دیتے ہیں------" (۷)

غرض یہ کہ ان کے کالم معنی کا ایک جہان اور لطف و انبساط اور بصیرت کا بڑا سامان اپنے دامن میں رکھتے ہیں---- ان کے کالموں کی ایک "کلیات" شائع ہونی چاہیے اور یقین ہے کہ دیر سویر یہ ضرور مرتب اور شائع ہو گی۔

(۵)

"عالی صاحب کی کالم نگاری اردو میں ایک مقام رکھتی ہے----- ان کا ہر کالم ایک جدا باب ہوتا ہے اس لئے ان کے ہر کالم کو وقت اور مقام کی نوعیت سے دیکھنا اور جانچنا مناسب ہو گا۔ قارئین کے معیار' قابلیت کا احساس اور اخبار کی پالیسی کالم نگار کے سامنے ہوتی ہے۔ عالی صاحب ان محدودات کے باوجود بے باک ترسیل کے حامی ہیں"۔(۸)

عالی کی اظہاریہ نگاری جب اپنے فکری پس منظر میں انفرادی طرزِ احساس سے نکھر کر معروضیت سے ہم آہنگ ہوئی ہے تو اس میں غیر شخصی تجربے کی بازگشت نے حسنِ معنی کے وہ منظر تخلیق کئے ہیں جو شعورِ انسانی کو دائمی قدروں سے ملا دیتے ہیں۔ اس سے موضوعاتی تنوع کی معنوی ہمہ جہتی کا وہ تناظر سامنے آتا ہے جو زندگی کے جمالیاتی پہلوؤں کا رجحان ساز منظر نامہ ہے۔ فکرِ عالی کا یہ داخلی رچاؤ اس لاشعور کی بازیافت ہے جو تخلیقی رنگا رنگی سے اظہار کی

راہ پاتا ہے۔ کیوں کہ ڈاکٹر انور سدید کے بقول :

"جمیل الدین عالی کے موضوعات علمی اور ادبی مدار میں گردش کرتے ہیں۔ انسانیت کے انحطاط، قدروں کی شکستگی اور ذوق مطالعہ کے زوال نے ان کے ہاں احساس ملال پیدا کیا اور یہ احساس ہی ان کے طنزیہ لہجے کا نقیب ہے"۔(۹)

عالی کی اظہاریہ نگاری اپنے لہجے کی محسوساتی پہچان رکھتی ہے کیونکہ جب وہ اپنے مخصوص انداز سے عصرِ حاضر کے مسائل کی تصویر کشی کرتے ہیں تو فکری سطح پر ان کا شخصی رابطہ اجتماعیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ ان کے ہم عصر کالم نویسوں کو پڑھتے ہوئے عموماً جس تہذیبی اور تاریخی شعور کی عدم موجودگی کا احساس ہوتا ہے وہ ان کے اظہاریوں میں ماضی کے دل کشا واقعات کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وقت کی رفتار کا تہذیبی شعور ان کے ہاں زماں کی علامتی وحدت کے روپ میں در آیا ہے۔ ماضی سے مستقبل کی طرف سفر تخلیقی پس منظر کے اس اجتماعی احساس کا وجود نامہ ہے جو صدیوں کے بعدِ زمانی کو اپنے دامن کی وسعتوں میں سمیٹ لیتا ہے۔ اس سے عصری رجحانات کا تہذیبی پس منظر اپنی معنوی فکر سے رجوع کرتا ہے جو جذباتی تلازموں کے بجائے معروضی جہتوں سے ترتیب پاتی ہے۔ آنے والے کل کی لحۂ موجود میں شناخت عالی کے اس ڈرامائی انداز کا خاص وصف ہے جو ان کے سفرناموں میں تاریخ کے شعوری پہلوؤں سے متعلق ہے۔ عصری حسیات سے مستقبل کے تحفظ کا احساس ان کے اظہاریے کا وہ تجزیاتی طریق کار ہے جو فکری تجربے کے مکالماتی مزاج کا ہمہ رنگ بیانیہ ہے۔ ادب سے سائنس تک تخلیقی پھیلاؤ کی اتنی عمدہ مثال ہمیں عالی کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتی۔ جب ان کا سمند شوق معلوم سے نامعلوم کی طرف اجتماعی سوچ کے ارتقائی رویے کا سفر شروع کرتا ہے تو وہ امکانات کے سماجی زاویے کے مرکزی نقطے کو اس تہذیبی اکائی سے ملا دیتے ہیں جو مسائل کی شعوری تفہیم کے معنوی اندازِ فکر کا ردِ عمل ہے۔ کیوں کہ محمد علی صدیقی کے بقول:

"وہ ایک بے باک تعقل پسند ادیب ہے۔ ہمارے ملک میں ایسے ادیبوں کی خاصی بڑی تعداد موجود ہے جو عالی کی اثباتیت پسند (Posotivistic) فکر سے حد درجہ "الرجک" ہیں۔ اگر ان حضرات کا بس چلے تو وہ عالی سمیت سائنس اور ٹیکنالوجی ہی کو ملک بدر کر دیں۔ لیکن جمیل الدین عالی ـــــــ اس گروہِ کم آگاہ اور کج بین کے خلاف مستقل مزاجی کے ساتھ نبرد آزما ہیں اور وہ ایک ایسے سماج میں علمِ مستقبلیات (Futurology) کا نعرہ بلند کر رہے

ہیں۔ جس نے اپنے اسلاف کے علوم از منہ وسطیٰ کو ایمان کے درجے پر فائز کر رکھا ہے"۔(۱۰)

(۶)

اظہاریہ نویسی عالی کی شخصیت کا بھرپور اظہاریہ ہے۔ انہوں نے فکری ہمہ جہتی کا جو منظر نامہ ترتیب دیا ہے وہ دراصل اپنی تہذیبی بازگشت کے اکتسابی مطالعہ کا اشاریہ ہے۔ شخصی کیفیات کی کائناتی تناظر میں نقش گری عصری حیات کی ان شعوری اقدار سے مستعار ہے جو اپنے تجزیاتی حوالے سے ایک منفرد انداز کی آئینہ سازی کا ممتاز پہلو ہیں۔ اظہاریوں میں موضوعاتی تنوع عالی کی فکر کا مشاہداتی حوالہ ہی نہیں احساس کی لاشعوری قوت کا تخلیقی کنایہ بھی ہے یہ وجدان کے اس مخفی تموج سے عبارت ہے جو روح کے تاروں سے مرتعش ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا ہر اظہاریہ دستاویزی حیثیت کا حامل ٹھہرتا ہے۔ یہ اپنے باطن میں اس نقطے کا محور قرار پاتا ہے جس سے انسانی زندگی اپنے ہونے کا احساس پاتی ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں------ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا' کا صوتی عکس کیفیتِ چشم سے آشنا ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ زندگی کی قدروں کا منظرنامہ اس جذباتی فضا سے مرتب ہوتا ہے جس میں فکری سطح تخلیقی تجربے سے مملو ہوتی ہے۔ اس سے شعورِ انسانی کی ہمہ جہتی کا وہ حیاتی تلازمہ سامنے آتا ہے جو معنوی دروبست کا ایسا وسیع المنظر بیانیہ ہے جس پر اپنے عہد کی بوقلمونی کے سارے رنگ قوسِ قزح کا سماں پیدا کر دیتے ہیں۔ عالی کے اظہاریوں میں رنگ و آہنگ کی یہ کارفرمائی اپنے جمالیاتی پن کا احساس لئے ہوئے ہے۔ گویا رنگ کے شعوری پیکر سے بے رنگی اپنے جمال کا عکس دے رہی ہے۔ محسوساتی فضا کا یہ معنوی رویہ دراصل اس تصور کا عکس نامہ ہے جو سفرناموں میں اپنے خارجی رجحان کا تدریجی حوالہ تھا۔ تاریخی شعور کا فکری پس منظر اپنے داخلی احساس سے نموپذیر ہے۔ خارج و باطن کی یہ یک رنگی ان کے دوہے میں جا کر اپنے حسنِ کمال کو پہنچتی ہے۔ برصغیر کی متصوفانہ روایت میں ان کی فکری تہذیب اس انتہائی بلندی کی طرف محوِ پرواز ہے جو ادبیاتِ اسلامیہ میں خسرو کی میراث ہے۔ اس سے قبائے ذات کی داخلی خوشبو کا وہ وجدانی کیف کشید ہوتا ہے جو فکر کی تہذیبی معنویت کے محسوساتی رابطے سے عبارت ہے۔ عالی جب تاریخی پس منظر سے اپنے عہد کی صورت گری کا نقش ابھارتے ہیں تو پاکستان ان کی محبت کا محور قرار پاتا ہے۔ یہ دراصل ان کی فکر کا وہ مکمل اور مربوط تناظر ہے جو وحدت کی لحاتی تشکیل سے جنم لیتا ہے۔ اس سے وہ

اپنے وجود کا شعوری تشخص ابھارتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو عصری انفرادیت میں انفس سے بڑھ کر آفاقی اقدار کا معنوی جائزہ ہے۔ اس سے ان کے ہاں ماضی کی طرف مراجعت کے بجائے مستقبل کی جانب پیش قدمی کا انداز در آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید معین الرحمٰن:

"وہ بڑے فعال، حساس، سچے اور کھرے پاکستانی ہیں۔ وہ پاکستان کو اپنی محبوبہ قرار دیتے ہیں، محبوبہ جو ماں بھی ہے اور ان کی پناگاہ بھی۔ جو ان کا حال بھی ہے اور آئیڈیل بھی------ "پاکستانیت" عالی صاحب کا امتیاز بھی ہے اور پہچان بھی، وظیفۂ حیات بھی ہے اور مقصدِ حیات بھی"۔(۱۱)

جمیل الدین عالی کے اظہاریے وطن کی محبت کے اس احساس کو اجاگر کرتے ہیں جو روح کی گہرائیوں میں اپنی تہذیبی روایت کا منظر نامہ بن جاتا ہے۔ زندگی کے سارے رنگ اس احساس جمال سے نکھرتے ہیں جو جنم بھومی کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اس سے دھرتی ماتا کا ہندوانہ تصور جنم نہیں لیتا بلکہ اسلامی تہذیب کا وہ فکری شعور نمایاں ہوتا ہے جو صدیوں کے فاصلے کو وحدت کی لڑی میں پرو دیتا ہے۔ سچائی کا عالمگیر جذبہ اپنی لامحدود انتہاؤں کا حوالہ ہی نہیں بنتا، تہذیبی روایت کا پیش خیمہ بھی بن جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے محبت کے فروغ کا موضوعی انعکاس دورِ حاضر کے مسائل سے براہِ راست وابستہ ہوتا ہے جس سے سماجی شعور کا دھارا مراقبۂ تخلیق کی اس وجدانی کیفیت سے حظ اٹھاتا ہے جو فرد کی جذباتی وابستگی کو آئینۂ خیال سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اس طرح معاشرے کی جو تصویر بنتی ہے وہ اس قدر صاف اور ہمہ رنگ ہے کہ اس سے عالی کی ژرف بینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرزا ادیب کے الفاظ میں:

"عالی نے اپنے کالم میں ملک ملک کے حالات، مشاہدات، واقعات ہی نہیں لکھے------ ہم جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں اس کے مسائل پر بھی غور و فکر کیا ہے"۔(۱۲)

عالی کے اظہاریے اپنے باطن میں رجائی اندازِ فکر کو سموئے ہوئے ہیں۔ ان میں امید افزا مستقبل کی وہ خوش آئند جھلک دکھائی دیتی ہے جو پاکستان کے لئے ان کا خواب بھی ہے اور آرزو بھی------ اور یہ جب دائرہ در دائرہ پھیلتی ہوئی آفاقی حدود کو چھو لیتی ہے تو اس کی داخلی حسیت کا معنوی وجود نامہ سامنے آتا ہے جو ان کی دینی ادا شناسی کا منت آشنا ہے۔ ان کی اس تہذیبی روایت سے فکر کے وہ تخلیقی تجربے نمو پذیر ہوئے ہیں جو عصری لمحات کی وسعتوں کو معنوی تناظر فراہم کرتے ہیں جس میں مستقبل کے امکانی زاویے کی پریشان بینی کا

سماجی شعور جھلکارے لینے لگتا ہے۔ اس سے ان کی فکری روایت نئے پن سے آشنا ہوئی ہے جو کشادہ نظری کا بیانیہ ہی نہیں ترجمان بھی ہے۔---- "دعا کر چلے" اور "صدا کر چلے" میں ان کی فکر وجدان کے اس جذباتی ماحول سے ماخوذ ہے جو گیان دھیان کی عملی وابستگی کا عکاس ہے۔ اس سے شخصی طرزِ احساس اجتماعیت کی اس علامتی معنویت سے جا ملتا ہے جو انسانی شعور کے تاریخی منظر کا ایسا رابطہ ہے جس کی انفرادی پہچان خارجی رنگوں میں محدود جہتوں سے عبارت ہے۔ عالی کا اظہاریہ اس حوالے سے عصری رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ لمحۂ موجود کی موضوعاتی منظر نگاری داخلیت کی فکری اساس کا اجمالی پیش منظر ہے۔ ان کی معنوی سوچ اس روحانی واردات سے حسن کشید کرتی ہے جو جذباتی طرزِ عمل سے پروان چڑھتا ہے۔ میر درد کے ہاں صوفیانہ احساس' ذات کے اس شعوری امکان سے ابھرتا ہے جو لمحاتی کیفیات کے منظر نامے کو ہمہ گیر کینوس پر پھیلا دیتا ہے۔ عالی کے ہاں موضوعی نقطۂ نظر کی جو کارفرمائی دکھائی دیتی ہے وہ دراصل اسی روحانی تجربے سے مستعار ہے جو احساس کی دنیا کا لاشعوری اظہار ہے۔ عالی کے اظہاریوں میں احساسِ جمال کی یہ ماورائی کیفیت کہیں بھی اوجھل نہیں ہوتی۔ اسی لئے داخلی پھیلاؤ لمحوں کی گرفت کا لاشعوری رابطہ بن جاتا ہے جو فکرِ انسانی کا محرک ہی نہیں' محور بھی ہے۔

عالی کے اظہاریوں کا تجزیاتی مطالعہ عصری حسیات کے فکری کینوس پر ماضی اور مستقبل کی احساساتی گمبھیرتا کا شعوری رشتہ ہے۔ "صدا کر چلے" اور "دعا کر چلے" کی معنوی ہمہ جہتی کا تکنیکی پھیلاؤ ان کے تصور انسان کی روحانی تعبیر سے منکشف ہوتا ہے۔ تمدن کی تاریخی وحدت انسانی شعور کے اس امتیازی پہلو کا امتزاجی حوالہ بن جاتی ہے جو مستقبل کی پیش بندی کا فکری رابطہ ہی نہیں داخلی تجربہ بھی ہے۔ اس سے تخلیقی قوتوں میں رجائی پہلو کی نمو پذیری کا عمل اپنی تہذیبی فضا سے مل کر اس فکری ہم آہنگی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ جس سے "مستقبلیات" جیسے معنی خیز امکان کا اپنے تہذیبی باطن میں سفر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ عالی کا اظہاریہ اپنے متنوع موضوعات کی تخلیقی وحدت کا علامتی وجود نامہ ہے۔ صداقت کی تلاش کا معنوی سفر جن ادیبوں کے ہاں دکھائی دیتا ہے ان میں سے چند ایک کو چھوڑ کر باقی لوگوں کے ہاں جذبے کی وہ شدت نہیں ملتی جو اس کارِ خیر کے لئے ضروری ہے۔ جذبے کی صداقت روحانی واردات کے وجدانی کیف و کم کا آفاقی پہلو ہے جس سے معروضی رنگ کا تہذیبی پس منظر اپنے فکری تناظر میں ابھر آتا ہے۔ جدید دور کی تاریخی سطح پر تخلیقی بازیافت ان عوامل

سے روشناس ہوتی ہے جو شعورِ ذات کے بنیادی عناصر کا جدلیاتی رشتہ ہیں۔ اظہاریہ' چونکہ شخصیت کے جذباتی اظہار کا ایسا بیانیہ ہے جو وقت کی لمحاتی گردش کو حقیقت کی نمو پذیری سے گرفت میں لے لیتا ہے اس سے فکرِ انسانی کے موضوعی استعارے اپنے باطنی مفاہیم کا تمثیلی تجزیہ بن جاتے ہیں۔ اس طرح کا ارتقائی زاویۂ تخلیق' فنی ریاضت اور اثباتیت فکر کا تقاضہ کرتا ہے جو اپنے مثبت اور معنوی مناظر کا طلسماتی نگارخانہ ہے۔ عالی اس حوالے سے اپنے اظہاریے کو مرکزِ امید سے زرخیز پاتے ہیں جو اپنے ہم عصروں میں ان کی علمی اور ادبی پہچان بھی ہے اور انفرادیت کا باعث بھی۔

حواشی:

۱۔ جمیل الدین عالی ''نقار خانے میں'' روزنامہ جنگ' لاہور' ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء مشمولہ نثری ادب مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمن' نذر سنز لاہور' بار اول ۱۹۸۶ء' ص ۱۶۳۔ ۱۶۴

۲۔ جمیل الدین عالی سے فیاض اعوان کا انٹرویو' ماہنامہ خوبصورت' کراچی' جولائی ۱۹۹۱ء' ص ۲۵

۳۔ ایضاً

۴۔ اور مرتب نے کہا' پندرہ روزہ چنگاری' دہلی (کالم نگاری نمبر)' مرتبہ فکر تونسوی' ۱۹۸۴ء' ص ۸

۵۔ شاہکار بک فاؤنڈیشن' کراچی' طبع اول' اگست ۱۹۸۵ء

۶۔ مکتبہ اسلوب' کراچی' طبع اول' ۱۹۸۷ء

۷۔ عرض ناشر' ص (ت)' جمیل الدین عالی' صدا کر چلے

۸۔ شبیر علی کاظمی' عالی کا نظریۂ نگارش مشمولہ جمیل الدین عالی..... فن اور شخصیت' مرتبہ ایم۔ حبیب خان' علمی مجلس' دہلی' ۱۹۸۸ء' ص ۶۵

۹۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ' مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد' بار اول فروری ۱۹۹۱ء' ص ۵۹۲

۱۰۔ جمیل الدین عالی۔ ایک مطالعہ' مشمولہ تخلیقی ادب (۳) مرتبہ مشفق خواجہ' اکتوبر/ نومبر ۱۹۸۳ء' ص ۶۴۷

۱۱۔ نثری ادب' نذر سنز لاہور' بار اول' ۱۹۸۶ء' ص ۱۶۱

۱۲۔ عالی سے ملے لیکن------' مشمولہ تخلیقی ادب (۳) مرتبہ مشفق خواجہ' ص ۶۹۷

عالی کی شخصیت نگاری
ایک مطالعہ

(ا)

"------ خاکہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس کا خام مواد کسی دوسری شخصیت کے اخذ و مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ایک عمدہ خاکہ نگار اس خام مواد کو من وعن پیش نہیں کرتا، بلکہ مختلف واقعات کو مشاہدہ بین کے تاثر اور تجزیے کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے اور یہی وہ مشکل مرحلہ ہے جہاں مصنف کے تخلیقی جوہر سے مسِ خام یا توکندن بن جاتا ہے یا راکھ۔ شائد اسی لئے مجنون گھورکھپوری، خاکہ نگار کے لئے متجسس اور دریاب نگاہ ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے نزدیک اس فن میں طوفان چلنے کے لئے بیتاب ہوتا ہے لیکن ازلی طور پر اظہار کے راستے مسدود ہوتے ہیں ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی اسے ایک ایسے صراطِ مستقیم سے تعبیر کرتے ہیں جو بال سے زیادہ باریک اور تیغ سے زیادہ تیز ہے۔ علی عباس حسینی (خاکہ نگاری کو) شخصیت نگاری کی مشکل ترین قسم تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی عظیم ہستی کے واقعاتِ حیات کو بیان کر دینا اور اس کے کارناموں، شاہکاروں اور تصنیفوں پر تقریظی نظر ڈال دینا نسبتاً آسان کام ہے لیکن شخصیت نگاری کے فن میں کامیابی کے لئے مردم شناس نظر کے ساتھ ساتھ عام انسانی نفسیات سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ علی عباس حسینی اس فنکارانہ سبک دستی کو جو غیر جمیل نقوش میں بھی آب و رنگ بھر دے اہم قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم خاکہ نگاری کے لئے انسان کی شخصیت کا ہمدردانہ ادراک ضروری سمجھتے ہیں۔ معین الدین کے نزدیک اس صنف میں تاریخی واقفیت سے زیادہ شخصی تاثر کی دھوپ چھاؤں کو اسیر کرنا پڑتا ہے۔

نثار احمد فاروقی خاکہ نگاری کو تنقید یا تنقیص کے برعکس شخصیت کی عکاسی کا نام دیتے ہیں

اور یحییٰ امجد کا تقاضا ہے کہ خاکے کے تعارفی جملوں اور واقعات سے ایسا تاثر مرتب ہو جس سے شخصیت زندہ ہو کر سامنے آئے۔

ان سب باتوں کو ملحوظِ نظر رکھیے تو اردو ادب میں بہت کم ایسے خاکہ نگار ملتے ہیں جنہوں نے آزمائش کے ان تمام مرحلوں کو پوری کامیابی سے سر کیا ہو۔ شاید اسی لئے ڈاکٹر وزیر آغا اس فن کو "کارگہ شیشہ گراں" کا عنوان دیتے ہیں اور محمد طفیل ایک ایسی تلوار کا جس سے خود لکھنے والا بھی زخمی ہوتا ہے"۔(۱)

(۲)

اردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایت کچھ اتنی قدیم نہیں۔ لیکن جن لوگوں نے اس صنف میں دادِ سخن دی' ان کے نام جریدۂ ادب پر ثبتِ دوام ہوئے۔ مگر شخصیت نگاروں کی اس فہرست میں ایک نام ایسا بھی ہے کہ جن کا کام نقادوں کی توجہ سے محروم رہا۔ بے اعتنائی کی یہ فضا دراصل ان کی اپنی بے نیازی کے سبب پیدا ہوئی۔ انہوں نے قلم سنبھالا تو لکھتے گئے جو کچھ لکھا خوب لکھا۔ ایک طرف پھول کے مضمون کو سو سو رنگوں سے باندھا تو دوسری طرف گنجینۂ معنی کے درِ وا کئے۔ خاصا کام دوستوں کے تعاون سے کتابی صورت میں چھپ گیا۔ لیکن اس کے باوجود بیشتر کام ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہے۔

جمیل الدین عالی نے کئی شخصیات کو موضوعِ تحریر بنایا ہے لیکن ابھی ان کے خاکے کتابی صورت میں مرتب نہیں ہوئے۔ فنی نقطۂ نظر سے عالی کی جو تحریریں شخصیت نگاری کے زمرے میں آتی ہیں ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱۔ اختر الایمان ------ خاکہ (۲)

۲۔ نواب سراج الدین سائل دھلوی (۳)

۳۔ لال میاں (۴)

۴۔ استادی اور یاری: (صوفی غلام مصطفیٰ تبسم) (۵)

۵۔ مولانا ماھر القادری (۶)

۶۔ دوست' ادیب' فکشن' بڑا آدمی: ابن انشاء (۷)

(۳)

شخصیت نگاری کی صنف اپنے خالق سے جس مشاہداتی کینوس اور حسی ادراک کا تقاضا کرتی ہے' اس کی عالی کے ہاں' کوئی کمی نہیں۔ جب وہ چہرہ نمائی سے بڑھ کر پیشِ نظر شخصیت

کے باطن میں سفر کرتے ہیں تو ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ سے بے نیاز ہو کر اس تہذیبی تار و پود سے شخصی قدر و قیمت کا احساس پا لیتے ہیں جو کسی بھی شخصیت کے باطن میں براہِ راست منعکس ہو رہا ہوتا ہے ان کی موضوعاتی گرفت خارج و باطن کے باہمی ارتعاش سے ماخوذ ہے وہ اس منظر نامے پر اپنے سنجیدہ مطالعے کا عکس اس طرح بناتے ہیں کہ خاکہ اپنے ہم زاد کا آئینہ بن جاتا ہے۔

اختر الایمان ------- عالی کا پہلا خاکہ ہے۔ نیا دور کے تیرہ صفحات کے اس خاکے میں انہوں نے تاثراتی اور نفسیاتی مطالعہ کی آمیزش سے اختر الایمان کی زندگی کے وہ نقش ابھارے جو ان کے حافظے نے یادوں کی دنیا میں محفوظ کر رکھے تھے۔ ممکن ہے کہ حالات اور وقت کی گردش انہیں دھندلا دیتی اور وہ اختر الایمان کا مطالعہ کافی وقت گزرنے کے بعد اس صورت میں نہ کرپاتے جیسا کہ پیشِ نظر خاکے میں ہوا ہے۔ ان دونوں کی دوستی کا آغاز ۱۹۴۰ء میں ہوا اور عالی کے بقول "جب اس سے ملا تو میں ایک بچہ تھا اور غیر شعوری طور پر ہی سہی مگر وہ مجھ پر بہت دنوں اثر انداز رہا"۔(۸)

عالی کی طبیعت چونکہ سنجیدگی کی طرف مائل ہے اس لئے ان کے ہاں معنوی تہہ داری اپنا الگ ذائقہ رکھتی ہے۔ ایک نقاد اکثر اوقات مصنف کی تحریر کے راستے اس کی ذات کا عرفان حاصل نہیں کرپاتا۔ لیکن خاکہ نگار اس کی زندگی کے ان حقیقی اور اصلی رنگوں کا تجزیہ کر ڈالتا ہے جو اس کی ذات کے بنیادی نقش و نگار ہوتے ہیں۔ گویا خاکہ نگار شخصیت پر پڑا ہوا پردہ ہی نہیں ہٹاتا بلکہ اپنے موقلم سے ایسی تصویر بنا دیتا ہے جو اصل نما لگتی ہے۔ وہ اپنے جذبات و احساسات سے اس تصویر میں افسانوی رنگ نہیں بھرتا کیونکہ اس کا شخصی مطالعہ ان بنیادوں پر استوار ہوتا ہے جن سے کوئی بھی شخصیت اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ادب کے پردۂ اسکرین پر ابھر آتی ہے۔

اختر الایمان کے خاکے میں بعض ایسے لمحے سمٹ آئے ہیں جو ان کی شاعری کو سمجھنے کے لئے ایک بنیادی نکتہ بن جاتے ہیں۔ زندگی کی ان اقدار کا جمالیاتی پھیلاؤ بہت وسیع ہے۔ جب وہ احسان دانش کے کہنے پر محنت کا تمغہ اپنے سینے پر سجا لیتے ہیں تو سچائی، حسنِ خیال کے ان فطری رنگوں میں منعکس ہوتی ہے جو آرائشِ جمال کا عمومی رجحان ہیں۔ اس سے آئینۂ خیال میں چہرہ نمائی کا عمل کسی بھی شخص کی فکری تحلیل کا عکس بن جاتا ہے۔ رنگ اور آہنگ کی مطابقت روح اور جسم کی اس مشترک اکائی پر جاکر منتج ہوتی ہے جو بیانِ واقعہ سے ترتیب پاکر

قفلِ ذات کی کلید کا درجہ پالیتی ہے۔ اس حوالے سے اختر الایمان کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ اس من مورت سے لگا کھاتی ہے۔ جو محبتوں کے آکاش پر مہتاب کے گرد روشنی کا ہالہ بن کر روح کی پاکیزگی کو اپنا لیتی ہے۔ ذوقِ عمل کی فکری اساس اسی نقطۂ نظر سے ترتیب پاتی ہے جو معیارِ نظر کے احساس کا بیانیہ ہے۔ اس کی ذائقہ شناسی نئے رویوں کی جذباتی فضا سے ہم آہنگ ہے۔ شخصیت کی معنوی گہرائی حقیقت کی ہمہ رنگی کے فکری کینوس کا مکمل مشاہدہ ہے۔ اختر الایمان کا پیکر' عالی کے کمالِ فن سے یوں نکھرتا ہے جیسے پھول کی پتیاں شبنم کے قطروں سے دھل کر اپنی رعنائیوں سے ہم آغوش ہو گئی ہوں۔

اختر الایمان نے بہت محروم زندگی گزاری لیکن ان کی ذات کسی کھوکھلے پن کا شکار نہیں ہوئی۔ حسنِ ذات کا عکس جب داخل سے خارج میں نمایاں ہوا تو ان کی شخصیت حسن و جمال کی اس صورتِ اتمام سے مملو ہوئی جو پھیل کر محبت کے نکتے پر منتج ہوتی ہے۔ اس سے ان کے دل میں کسک اور خلش کا گمان تو گزرتا ہے لیکن آہیں بھرنے اور رونے کا انداز نہیں ملتا۔ رت جگوں کی اس جذباتی فضا میں آنکھیں کسی نادیدہ ہستی کی تلاش میں سرگرداں ہوتی ہیں تو شدتِ تاثر کی وجہ سے ان میں جلن کی کیفیت در آتی ہے۔ عالی کے بقول:

"اختر محبت بہت شدت سے کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں جلتی رہتی تھیں۔ کالج سے جانے کے بعد اس میں وہ شوخی اور شگفتگی نہیں رہی تھی جو اس کی کالج والی محبتوں کے زمانے میں بھرپور تھی۔ وہ روتا گاتا بھی نہیں تھا' نہ غزل کے شعر پڑھتا تھا' نہ لمبے لمبے فقرے بولتا تھا نہ اس نے اپنی محرومیوں اور اپنے تجربات تقسیم کرنے اور جونیئر لوگوں پر دھونس ڈالنے کی عادت ڈالی تھی وہ تو ایک تلاش سی کرتا رہتا تھا۔ ایک پیاس اسے رہتی تھی' پیار کی' چھاؤں' ٹھنڈی ٹھنڈی لوریوں کی جو اسے بچپن سے جوانی تک نہیں ملی تھیں"۔(۹)

سائل دہلوی ------ عالی کا دوسرا خوبصورت خاکہ ہے۔ پندرہ صفحات کا یہ خاکہ ضخامت کے لحاظ سے عالی کا سب سے بڑا خاکہ ہے۔ سائل دہلوی ان کے رشتے کے چچا تھے۔ عالی ان کے بہت لاڈلے تھے۔ خاکے میں ایک بے تکلفی کی فضا دکھائی دیتی ہے لیکن اس سے کسی قسم کی بے ادبی کا گمان نہیں گزرتا۔ انہیں سائل سے جو تعلق خاطر تھا اس کا ہر جملے سے پتہ چلتا ہے۔ محبت اور خلوص کا احساس جمالیاتی قدروں کی اس گمبھیرتا سے ہوتا ہے جو تہذیب کی اوٹ سے اپنا عکس دکھا رہی ہے۔ مشفق خواجہ کے بقول:

"سائل دہلوی کا خاکہ یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بدلتی ہوئی قدروں کی سفاکی اور قدیم

معاشرتی وضع کا ایک ایسا اشاریہ ہے جو بڑے خلوص کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے"۔(۱۰)

(۴)

جمیل الدین عالی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت ہیں۔ ان کی ذات خبر اور نظر کے اس توازن سے مرتب ہوئی ہے جو تہذیبی اقدار کے دامن سے پھوٹتا ہے اور ان کی تخلیقی قوت اس صداقت سے مشتق ہے جو معنوی حسن اور رعنائی خیال کی آئینہ دار ہے۔ زندگی کا وہ نقطۂ ارتکاز جس پر خارج اور باطن کا حسن خیال اور خیال حسن ابدیت کی دائمی قدروں سے آشنا ہوتا ہے فکری تموج کے صدہا رنگوں میں بکھرنے اور فنی تطور کے بے رنگی میں سمٹنے سے جنم لیتا ہے۔ بکھرنے اور سمٹنے کا یہ عمل جب عرفان ذات سے بڑھ کر بے خودی کی لذت سے کیف گیر ہو جائے تو انکسار ذات سے حق شناسی کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں۔ اس حوالے سے کسی بھی شخصیت کا مطالعہ دراصل ان تہذیبی رویوں کا تجزیہ ہے جو اساطیری عناصر سے ہٹ کر' واقعاتی سچائیوں سے ترتیب پاتے ہیں۔ اس تناظر میں زندگی کے سارے رنگ جمالیاتی احساس سے نکھر کر خوشبوئے ذات کا وجود نامہ بن جاتے ہیں۔ جذبات کی رنگارنگی پیکر ظاہری کے اس باطنی حسن کو نمایاں کر دیتی ہے جو کیفیات کے معنوی اسرار سے عبارت ہیں۔ چونکہ شخصیت نگاری کا فن احساس و شعور کی کرشمہ سازی ہے اس لئے اس کے ہالے دائرہ در دائرہ کائنات کی وسعتوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اس سے خارجی مناظر کا مطالعہ داخلیت کے منظر نامے پر مسحور کن انداز اختیار کر لیتا ہے۔ اختر الایمان اور سائل دہلوی کے خاکے پڑھنے کے بعد مجھے عالی کی اس شیتل آتما کی مدھرتا اور نفاست کا عرفان ہوتا ہے جو گیان دھیان سے صیقل ہو کر ماورائی حسن کی جلوہ سامانیوں سے ہم آغوش ہو گئی ہے۔ اس سے رعنائی خیال اور رنگینیٔ فکر' معنی کی ان وسعتوں سے مستنیر ہے جو شخصیتوں کی دریافت میں شخصی تاثر کو فکری اساس پر پرکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس حوالے سے عالی نے عکس درون ذات کو خارج میں موجود رنگوں سے ملا کر شخصی خاکے کو ایک نئے رنگ سے آشنا کیا ہے جو فطرت کی بوقلمونی کا عکاس ہی نہیں انکشاف بھی ہے۔

شخصیت نگاری چونکہ دو شخصیتوں کے مابین ہم کلامی کا اظہاریہ ہے اس لئے خوشبو کی طرح اس کا دائرہ کار بھی بے پناہ وسعتوں سے ہم کنار ہے جو بعض اوقات خارج و باطن' قدیم وجدید اور شعور ولاشعور تک پھیل جاتا ہے کہ صدیوں کا سفر بھی اس کا احاطہ نہیں کر پاتا۔

شخصیت نگار خارجی منظر' داخلی رنگ میں ڈھال کر وہ پیکر تراشتا ہے جو حیاتی وجود کی

سرمستی کا بیانیہ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ اپنے امکانی رابطے کو پھیلا کر معروضیت سے ہم آہنگ کر دیتا ہے لیکن اس کے باوجود کیفیت سازی کا یہ رشتہ شخصی زاویۂ نگاہ سے منقطع نہیں ہوتا۔ بلکہ دونوں کی آمیزش سے ایک ایسا رنگ وضع ہوتا ہے جو خیر کی تلاش کا حسنِ اتمام بن کر سامنے آتا ہے۔

عالی کے خاکوں میں تلاشنے کا عمل تخلیقی سطح پر ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس کی وسعت پذیری تلاش ذات سے عرفان ذات تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں احساس جمال کی وہ شدت دکھائی دیتی ہے جو جذباتی فضا کو گرفت میں لے کر عصری شعور کا منظر نامہ بنتی ہے۔ اس سے خاکوں میں قیاس آرائی کے بجائے کشف کا سا رنگ در آتا ہے جو پیشِ نظر شخصیت کی حیات نو کو دوامی حسن سے آشنا کرتا ہے۔ مشاہداتی سنجیدگی، تصور کی اس رعنائی کو پالیتی ہے جو بسطِ خیال کی مختلف صورتوں کا آئینہ ہے۔ سرمدی شعور کی وہ لہر جو کردار کے امکانی زاویۂ نظر کو نکھار کر حقائق سے ہم آہنگ کرتی ہے، اس رد عمل کا نتیجہ ہوتی ہے جو جذباتی رنگ کی حسی اقدار کا منظر نامہ بنتے ہیں۔ اس سے کسی بھی شخصیت کی معنوی فضا لفظوں میں سمٹ آتی ہے۔ لفظوں کی مہک خیال کے رابطے کو حقائق کے اس حسی جذبے سے ملا دیتی ہے جو سوز باطن کو حسیاتی کینوس پر بکھیر کر فکری جہتوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ اس سے شخصیت کا خارجی انتشار داخلی وحدت سے گھل مل کر اس کیفیت سازی کا باعث بنتا ہے جو کائناتی تناظر میں اپنے وجود کی اساس کا مرکزی نکتہ ہے۔ یہ انکسارِ ذات سے انائے ذات تک اس معنوی نیرنگی کا شعوری رابطہ بنتا ہے جو حقیقت اور سچائی کی گردان کے تمثیلی رنگ میں مدغم ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے روح کا ارتفاع سچائی کے اس منظرنامے کا عکس ہے جو تہذیب اور ثقافت کے ماحولیاتی عناصر کا ترکیبی حصہ ہے۔ سائل دھلوی کا خاکہ پڑھتے ہوئے ان تہذیبی قدروں کا تاثر ملتا ہے جو روایت کی پاسداری کا خوبصورت اور عمدہ نمونہ ہیں۔ ان کی شخصیت اگرچہ نشاط انگیزی سے مملو ہے لیکن اس میں تعیش کی بے راہروی نظر نہیں آتی جو بدلتی ہوئی قدروں کے زمانوں کا لازمہ ہوتی ہے۔ قدیم و جدید روایتوں کے سنگم پر ان کی شخصیت کا جو نقش ابھرتا ہے وہ احساس کی اس گمبھیرتا کو سمونے کی کوشش ہے جو جلوؤں کے اژدھام سے حیرانی کے منظر تخلیق کرتا ہے لیکن اس کے باوجود تحیر سے چہرہ نگاری کا عمل کسی ناکامی سے دوچار نہیں ہوتا۔ زندگی کی مختلف النوع جہتوں کو چند صفحات میں سمو کر کسی بھی شخصیت کو حیات نو سے آشنا کر دینا کمالِ فن ہی نہیں، اتمام فن بھی ہے اور یہ خوبی ہمیں عالی کے خاکے "اختر

الایمان" میں بھی نظر آتی ہے۔ اس میں عالی کا سماجی شعور نئے مزاج سے اپنے تاثر کو تخلیقی تجربے کا روپ دیتا ہے انہوں نے اختر الایمان کی زندگی کے تانے بانے کو معاشرتی فضا سے ملا کریوں پیکر بنایا ہے کہ خاکے میں جان سی پڑ گئی ہے۔ یہاں وہ بتان آذری کو اس معنوی حسن سے نکھارتے ہیں جو شبنم کے کومل احساس کو بھی زندگی کی ان حقیقتوں سے مانوس کر دیتا ہے جو حسن کی خوشبو سے مستعار ہیں۔ اس خاکے میں تخلیقی تجربے کی متعدد سطحیں ملتی ہیں جو ان کے ذہنی اپج کا اظہار ہیں۔ اپنے خاکوں میں انہوں نے شخصی رنگ کو سو قرینوں سے برتا ہے اگر اس کو بھی "عالی چال" (۱۱) کہا جائے تو کچھ اتنا بے جا نہیں کیوں کہ ان کے خاکے ان کے ہم عصروں سے الگ ایک انداز اور پس منظر رکھتے ہیں۔ وہ پیش نظر شخصیت کے وجود کا کھوج لگاتے اور اس کی متماثل صورتوں کا تخیلاتی پس منظر تخلیق کرتے ہیں۔ اس سے شخصیت نگاری آگہی کے اس مکمل حسن کا تقاضا کرتی ہے جو لامحدود افق پر پھیل کر دھنک رنگ فضا کا پیش خیمہ ہیں۔

"استادی اور یاری" میں صوفی تبسم کی شخصیت کا شبنمی رنگ اس تخلیقی عمل کی حیاتی صداقت کا تلازمہ ہے جو معنوی پیکر میں ڈھل کر وجدانی تجربے کا حصہ بن گئی ہے۔ یہ فکری پس منظر کی معنی خیزی کا ایسا بیانیہ ہے جو کسی بھی طرز احساس کی نفسیاتی توجیہہ ہی نہیں انسانی تجربے کی تخلیقی وحدت بھی ہے۔ اس سے خارج کا علامتی حسن باطن کے تجسیمی پن سے مملو ہوتا ہے۔ شخصیت نگاری کا یہ پہلو ذاتی سطح سے بلند ہو کر اجتماعی سطح تک پھیل جاتا ہے جو یادوں کی تعبیر بن کر حرف دعا کے عکس بناتی ہے۔ اس سے داخل کا جذباتی احساس خارج کے سیمابی کیف سے روشناس ہو جاتا ہے جو ماضی کے لمحات کو شخصی تناظر میں رکھ کر شناخت کا آئینہ بنتے ہیں۔ اس سے گہری بصیرت کی وہ لہر در آتی ہے جو خود پسندی کے جذبوں کا حصار کرتی ہوئی شخصیت کی داخلی کیفیت تک پھیل جاتی ہے۔ عالی شخصیت کی بنت میں فکری عناصر کی کارفرمائی اور ان جذبوں کے بیانیہ سے کرتے ہیں جو عصری شعور کو نئے روپ میں ڈھالنے کا قرینہ فراہم کرتا ہے۔ اس سے شخصی تحلیل کا وہ احساس جنم لیتا ہے جو ذاتی تجربے سے آگے بڑھ کر معروضی انداز سے مربوط ہے۔ جب یہ تجربے تخلیقی ساعتوں سے ہم آغوش ہوتے ہیں تو ان کے تحریر کردہ خاکے اس دائمی حسن سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں جو معنوی صورت حال کا معمولاتی رشتہ ہے۔

تہذیبی اختلاط کی وہ شعوری روایت جو قدیم و جدید رنگوں کی ہم آہنگی کے پس منظر سے

ابھرتی ہے۔ انسانی مزاج کے حیاتی انجذاب کا عکس نامہ بن جاتی ہے۔ جس سے اجتماعی یادوں کے منظر اپنے تزیہی حسن کو محسوساتی سنجیدگی سے نکھارتے ہیں۔ تہذیبی امتزاج کے فکری دھارے اس ذاتی اور شخصی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں جو نفس ذات کی نقش گری کا تصوراتی پہلو ہے اس سے تہذیبی ارتباط کا نظری پس منظر اپنے افقی تناظر کو عمودی زاویے کی متوازی لہروں سے نکھار کر سامنے لاتا ہے اور کسی بھی شخصیت کی دریافت اور عرفان کے لئے ممد ہوتا ہے۔ سائل دھلوی کے خاکے میں عالی نے اس سے خوب حظ اٹھایا ہے' وہ یہاں ان قدروں کی بازیافت کرتے دکھائی دیتے ہیں جو تہذیب کی معنوی صورت گری کا ہمہ گیر امتزاج ہے۔ اس تہذیبی ماحول میں سائل دھلوی کی شناخت وہ مراقبہ خیال ہے جو شخصی تاثر سے تخلیق پاتا ہے۔ اس میں جذباتی وارفتگی اور حیاتی وابستگی کا موضوعی رنگ و آہنگ تلاش ذات کا جواز بن جاتا ہے۔ جس سے سائل کے پہلو بہ پہلو عالی کی اپنی ذات بھی جھلکارے لینے لگتی ہے۔ یہ دراصل وہ احساس جمال ہے جو نگار خانے میں ان کی شخصی حیثیت کو منفرد اور ممتاز رکھتا ہے۔ کہیں کہیں اس حسنِ دل نواز کی بے نیازی خود پرستی کے وہ منظر بھی اجاگر کرتی ہے جو ہمیں دیوان غالب پڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں کہ کائناتی تناظر میں ان کا مطالعہ دراصل زندگی کی ان جہتوں کا مطالعہ ہے جو انفرادی رنگ سے نکھر کر تابناکی اور روشنی کا مظہر بنتے ہیں۔ اس سے خارج کا بعد زمانی اور مکانی باطن کی وسعت میں سمٹ کر حسن زیبا کی اس دوھری سطح سے مل جاتا ہے جس سے فخر و مباھات کی لہریں ارتعاش ذات سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ یہ عمل وجدان کی اس جذباتی سطح پر رونما ہوتا ہے جو مشاھدے کی فکری رو سے مستفید ہے۔ اختر الایمان کا خاکہ پڑھتے ہوئے اس کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں تجسس کی جو کارفرمائی ملتی ہے وہ شخصیت کے داخلی منظر نامے کی شناسائی کا پتہ دے رہی ہے۔ عالی کے خاکوں میں دلکش مناظر کی جو تہذیبی حیثیت بن رہی ہے وہ اسی ذاتی سنجیدگی کا نتیجہ ہے جو ان کے خاندانی پس منظر کی دین ہے۔

(۵)

جمیل الدین عالی شخصیت نگاری کی وادی میں ابر بہاری کی طرح کبھی کبھار جلوہ نما ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے خاکے اپنے منفرد انداز کی وجہ سے زندہ رہنے کا احساس اور اعتماد رکھتے ہیں۔ ان میں جذباتی صداقتوں کا جو تسلسل ملتا ہے وہ اس شعوری کیفیت کا غماز ہے جو قدیم تہذیب کو عصری زندگی میں شامل کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ کسی بھی شخصیت کی اتنی

متنوع اور جاندار رنگوں میں چہرہ نمائی کہیں اور نظر نہیں آتی جتنی صاف اور شستہ تصویر عالی کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ اس مشینی دور میں سائل کا خاکہ پڑھتے ہوئے آنکھوں میں انسانیت کے خواب جھلکنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی تمام تر وضع داریوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے پھرتے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے باطن کی امکانی روایت کا عکس بدلتی ہوئی قدروں میں بھی سچائی اور صداقت کی لو دے رہا ہے۔ عصرانہ صداقت کی حیاتی ماہیت ان یادوں سے منور ہے جو شخصی پس منظر سے ابھر کر خوشبوؤں کے روپ میں اپنے جمالیاتی پن سے آشنا ہوتی ہے۔

عالی کو پڑھتے ہوئے خاکوں کی اثر انگیزی کا اندازہ ہوتا ہے جو دوران مطالعہ وارد ہوتی ہے۔ اس اثر آفرینی میں تمام فنی وسیلوں کے ساتھ ان کا خلوص بھی کارفرما ہے۔ جو شخصیت نگاری کے فن کو وہ رفعت عطا کرتا ہے جس سے ان کی اپنی ذات بہرہ ور ہے۔ ان کے سینہ جان پر الفاظ صداقت کے موتی بن کر اپنا نزول کرتے ہیں۔ لفظوں کی حرمت تقدیس فن کے لئے روح کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن بہت کم لوگ اس سچائی کا عرفان کرپاتے ہیں۔ جو لفظوں کے باطن سے پھوٹتی ہے۔

حواشی :

۱۔ ڈاکٹر انور سدید' اردو میں خاکہ نگاری' ص ۳۲۹۔۳۳۰ مشمولہ "محمد نقوش" مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمن' مکتبہ کارواں' ملتان' بار اول' ۱۹۸۳ء

۲۔ نیا دور' کراچی' شمارہ ۷' ۸

۳۔ ماہنامہ "ہم قلم" کراچی' اگست/ ستمبر ۱۹۶۰ء

۴۔ روزنامہ جنگ' کراچی' ۱۰۔ اپریل ۱۹۶۷ء بحوالہ جمیل الدین عالی' دعا کر چلے' مکتبہ اسلوب کراچی' بار اول' ۱۹۸۷ء

۵۔ روزنامہ جنگ' کراچی' ۱۰۔ مارچ ۱۹۷۸ء

۶۔ روزنامہ جنگ' کراچی' ۲۔ جون ۱۹۷۸ء

۷۔ روزنامہ جنگ' کراچی' ۱۵۔ جنوری ۱۹۷۹ء

۸۔ اختر الایمان۔ خاکہ' نیا دور' کراچی' شمارہ ۷' ص ۱۳۲

۹۔ اختر الایمان۔ خاکہ' ص ۱۱۴' نیا دور' کراچی' شمارہ ۷' ۸

۱۰۔ حرفے چند' جمیل الدین عالی' کراچی' ۱۹۸۸ء' مقدمہ' ص ۱۴

۱۱۔ اپنا چھند الگ ہے جس کا نام ہے عالی چال

عالی
بحیثیت مقدمہ نگار

(۱)

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی وفات (۱۹۶۱ء) کے بعد انجمن ترقی اردو کی جو تنظیم نو ہوئی، اس میں جمیل الدین عالی کا تقرر معتمد اعزازی کے طور پر ہوا۔ یہ ان کی زندگی میں بھی انجمن سے وابستہ تھے۔ خود عالی صاحب کے بقول:

"(جب بابائے اردو کی) صدارت میں انجمن کا نیا دستور لکھا جا رہا تھا، انہوں نے راقم الحروف کو اپنی متعلقہ کمیٹی میں نامزد کر رکھا تھا۔ دستور ان کی وفات کے بعد ۱۹۶۲ء میں نافذ ہوا"۔(۱)

بابائے اردو کے آخری ایام میں جب انجمن سازشوں کا شکار ہو گئی اور ایک گروہ نے اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لئے انجمن پر قبضہ جمانے کی کوشش کی تو بابائے اردو کے جذبات کو بہت ٹھیس پہنچی۔ ان کی ذات، جو انجمن کے لئے بمنزلہ حیات تھی، ان واقعات سے بہت متاثر ہوئی۔ اس سے ان کا ذاتی وقار اور انجمن کی ساکھ دونوں خطرے میں پڑ گئے۔ یہ ہنگامہ آرائی اس قدر بڑھی کہ انجمن کا (تمام) علمی اور ادبی کام رک گیا۔ مالی حالات پہلے ہی ناگفتہ بہ تھے۔ اس سے قرضے کی شرح میں بطور خاص اضافہ ہوا اور حالات کی ستم ظریفی نے یہاں تک طول کھینچا کہ حکومت وقت کو اس میں دخل دینا پڑا۔ اس سانحے کی تفصیل بابائے اردو کے کتابچے "انجمن ترقی اردو کا المیہ" میں ملتی ہے۔ عالی نے بھی اپنے مقدموں میں اس جانب اشارے کئے ہیں۔

۱۹۶۲ء میں نئی انتظامیہ نے عنان کار سنبھالتے ہی اپنی مساعیٔ جمیلہ سے انجمن کو مشکلات

سے نکالا اور ترقی کی راہ پر ڈالا۔ عالی نے اس دوران جس مستعدی اور تن دہی کا ثبوت دیا' وہ مطبوعات کے معیار اور اشاعت کی رفتار سے عیاں ہے۔اپنے محدود وسائل کے باوجود اعلیٰ معیار کی بڑی تعداد میں کتابوں کی اشاعت' عالی اور ان کے ساتھیوں کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔ گذشتہ اٹھائیس برسوں میں عالی نے انجمن کی اڑھائی سو(۲) سے زائد کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں۔ جن میں سے ایک سو چار مقدمے ان کی کتاب "حرفے چند"(۳) کی زینت ہیں۔ جو ان کی معتمدی کے جشن سیمیں کے موقع پر زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ہے۔ اسے انجمن ترقی اردو نے چھاپا ہے۔ اس کی فہرست مندرجات ایک سو چار کتابوں پر مشتمل ہے۔ اٹھانوے کتابوں پر لکھے گئے مقدمے کتاب کی زینت ہیں جب کہ بقیہ چھ مقدمے دھرائے جانے کی وجہ سے شامل کتاب نہیں۔ ان کی وضاحت فہرست میں موجود ہے۔ باقی ماندہ حرفے چند' جن کی تعداد کوئی ڈیڑھ سو سے زائد ہے۔ بقول جمیل الدین عالی عنقریب دوسری جلد میں جگہ پائیں گے۔ موجودہ جلد پانچ سو چوبیس (۵۲۴) صفحات کو محیط ہے اور سفید (اچھے) کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے۔ ابتدا میں چودہ صفحات (۹ تا ۲۲) پر مشفق خواجہ کا دیباچہ ہے جو عالی کی شخصیت اور نثر نگاری کا بالعموم اور "حرفے چند" کے حوالے سے بالخصوص ایک عمدہ اور وقیع مطالعہ ہے اور ڈاکٹر انور سدید کے بقول:

"خواجہ صاحب کا مقدمہ 'کتاب اور صاحب کتاب دونوں سے مخلصانہ تعارف کراتا ہے"۔(۴)

"حرفے چند" میں فہرست مندرجات بلحاظ زمانہ ترتیب دی گئی ہے۔ پہلا مقدمہ ۱۹۶۳ء اور آخری ۱۹۸۸ء کا ہے۔ دریں اثناء لکھے جانے والے مقدموں میں جو ہمہ گیری اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ وہ کتاب کی موضوعاتی سنجیدگی اور افادیت سے عبارت ہے۔ عالی کے مذاق علمی اور حسن طبیعت کا کچھ اندازہ ان متنوع کتابوں سے بھی ہوتا ہے جو ان کی نگرانی میں شائع ہوئیں۔ انجمن کے مملوکہ بعض نادر اور قدیم نسخوں پر انہوں نے فاضلین ادب سے وہ تحقیقی کام کروایا جو اردو زبان کی لسانیاتی ترقی اور ارتقاء کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ نوادرات علمیہ کی تلاش اور جستجو تاریخ ادب کی ترتیب و تدوین کی ضامن ہے۔ اس سے تاریخی اور اجتماعی شعور جنم لیتا ہے جس کا حصول وسیع مطالعہ اور دقت نظر کے بغیر مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ "حرفے چند" میں عالی کی جو عالمانہ شان نظر آتی ہے وہ ان کی جودت طبع اور وسیع النظری کا نتیجہ ہے اس قدر مختلف النوع موضوعات پر اتنے عمدہ مقدمے

انہیں ایک معتبر مقدمہ نگار کی حیثیت سے سامنے لاتے ہیں:

"سو سے زائد کتابوں پر دیباچے بذات خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور دیباچے بھی وہ جو بربنائے تعلقات یا سطحی اور سرسری انداز میں نہیں لکھے گئے بلکہ ہر دیباچہ ایک علمی شان رکھتا ہے"۔(۵)

خالص علمی اور تحقیقی موضوعات چونکہ عام دلچسپی کے حامل نہیں ہوتے اس لئے ان سے متعلق کتابوں کے مصنف یا مرتب کم ہی شہرت اور ناموری سے متصف ہوتے ہیں۔ ویسے بھی تحقیق کا عمل خیر اور صداقت کی جن قدروں کا داعی ہے ان کی چھان پھٹک اور تلاش و جستجو میں بہت کم لوگ مرد میدان ہو پاتے ہیں۔ علمی اور تحقیقی کتابوں پر مقدمہ نگاری اس سے بھی اگلا قدم ہے۔ عزت اور وقار کے ساتھ اس کوچے سے ہو نکلنا ہر ایک کے بس کی بات کہاں! اسلوبیاتی شائستگی اور فکری سنجیدگی اس امتحان گاہ میں کامیابی کی دلیل تو ہیں' ضمانت نہیں۔ دوستی کے بندھن یا تعصب کی دھند سے بالاتر ہو کر کسی بھی سچے پارکھ کا تحسین یا تردید آمیز رویہ' ادب کی فکری بنیادوں کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔ جو نووار دان تحقیق کے لئے نشان راہ سے بڑھ کر ایک معیار اور کسوٹی کا درجہ رکھتا ہے۔ اپنی گوناگوں مصروفیات اور دیگر علمی و ادبی مشاغل کے ہوتے ہوئے ان کا اس فن میں نام پیدا کرنا ان کی وجاہت علمی پر مظہر ہے۔ اس سے ان کی شخصیت کی ہمہ جہتی کے کئی پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ وہ دوھے گاتے' انجمن سازی کرتے اور سفرنامہ لکھتے عجب انداز سے اس میدان میں اترے' خلوص نیت اور حسن عمل سے کام کیا اور بالآخر اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ بقول مشفق خواجہ:

"گذشتہ پچیس برسوں میں انجمن ترقی اردو کو زندہ فعال رکھنے اور اس کے اردو کالج کو ایک عظیم الشان ادارہ بنانے کے لئے عالی صاحب نے جس طرح تگ و دو کی ہے وہ ایک الگ داستان ہے۔ میں یہاں صرف اتنا عرض کروں گا کہ علمی و ادبی کاموں کی وہ روایت جسے مولوی عبدالحق نے شروع کیا تھا اور جو انجمن کا خاص کام ہے اسے عالی نے نہ صرف جاری رکھا بلکہ بعض حیثیتوں سے اسے آگے بھی بڑھایا"۔(۶)

عالی نے اس دورانیے میں نہ صرف نئی کتابوں پر ہی توجہ دی بلکہ ان کتابوں کے بھی کئی ایڈیشن شائع کئے جو بابائے اردو کی نگرانی میں چھپی تھیں۔ تین چار کتابوں پر اشاریوں اور ضمیموں کا اضافہ بھی کروایا۔ نئے دور کی بدلتی ہوئی قدروں کے مطابق لغات میں لفظ و معنی میں مناسب حک و اضافہ ان کا خاص کارنامہ ہے۔ قدیم شعری اور نثری ادب پاروں کی

ترتیب و اشاعت میں ان کی دلچسپی اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں۔ ان کے ایماء پر گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے بزرگوں کے مقالات کی تدوین، ان کی جوہر شناسی کی نشانی ہے۔ علاقائی زبانوں کے منتخبات کی (اردو) اشاعت، ان کی حب الوطنی اور جذبہ ملی کی ترجمان ہے۔ عالمی ادب عالیہ سے مشاہیر کے تراجم کی طباعت ان کی دانش جوئی کی مظہر ہے۔ شعراء و ادباء کے تذکروں، مخطوطات کی توضیحی فہرستوں، بچوں کے ادب اور غالبیات کی اشاعتوں پر ان کی مقدمہ نگاری ان کے ذوق سلیم کی ہمہ گیری کا منظر نامہ ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالات کی ترویج و اشاعت مقالہ نگاروں کی تحسین کا (ایک) انداز بھی ہے اور انجمن کی تخصیص کا سامان بھی۔

عالی نے انجمن کے زیر اہتمام ان کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جو اپنی موضوعاتی سنجیدگی اور علمی وقار کی بنا پر عام ناشرین کے لئے زیادہ دلچسپی اور کشش کا باعث نہیں ہوا کرتیں۔ کیونکہ ناشر حضرات زیادہ تر ایسے موضوعات پر کتابیں چھاپتے ہیں جو تجارتی نقطہ نظر سے منفعت کا باعث ہوں۔ مناسب کاغذ اور کم قیمت پر علمی کتابیں مہیا کرنا علم دوست اداروں کا منصب بھی ہے اور اختصاص بھی۔ انجمن ترقی اردو اس لحاظ سے شائد سب سے آگے ہے:

"تحریکیں ہوں یا ادارے، ان کی روح ہمیشہ کوئی ایسی شخصیت ہوتی ہے جو ان تحریکوں یا اداروں کے مقاصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتی ہے۔ رسمی طور پر کسی عہدے پر فائز رہنا اور بات ہے۔ کسی ادارے کے لئے اپنی تمام قوتیں اور توانائیاں وقف کر دینا دوسری بات ہے۔ یہی دوسری بات کسی ادارے اور فرد میں روح و تن کا تعلق پیدا کرتی ہے اور من و تو کا فرق مٹا دیتی ہے"۔ (۴)

یہ ایک ایسی ہمہ گیر سچائی ہے جو زندگی کے کسی بھی شعبہ میں آزمائی جائے تو یقیناً ثمر آور ہو گی۔ اس کی اثر پذیری کا اندازہ عالی اور انجمن ترقی اردو کے باہمی تعلق اور رابطے سے کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے جس شائستگی اور متانت کے ساتھ انجمن کے علمی کام سرانجام دیئے وہ ان کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

"حرفے چند" اس حوالے سے ان کی شخصیت کے صرف ایک پہلو کا اظہار ہے۔ اپنی جگہ یہ کارنامہ کوئی کم اہمیت کا حامل نہیں بلکہ پچیس برسوں کی علمی اور ادبی تاریخ کو محیط ہے۔

"حرفے چند" میں شامل مقدمات طویل بھی ہیں اور مختصر بھی۔ ان میں سے کچھ مقدمات

تنقیدی اور تحقیقی ہیں اور کچھ تاثراتی اور معلوماتی۔ مختصر مقدموں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے لیکن ان کے پر مغز اور معیاری ہونے میں کلام نہیں۔ وہ بے مقصد خامہ فرسائی نہیں کرتے بلکہ زیرِ نظر موضوع کی تمام ممکنہ جہتوں کا تعین اس انداز سے کرتے ہیں کہ تحقیقی استدلال اور تنقیدی اشارات جامعیت سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس کتاب میں جن مقدمات کی ضخامت دس سے زائد صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے ان کی تعداد نو ہے۔ بڑے سے بڑا مقدمہ چوبیس صفحات کا ہے۔ باقی ماندہ مقدمے ایک آدھ صفحے سے لے کر آٹھ دس صفحات(۸) کے ہیں۔ زیادہ تر مقدمات لغات اور مصطلحات پر لکھے گئے ہیں۔ ''حرفے چند'' میں ان کی تعداد پندرہ ہے۔ قدیم شعری متون اور مخطوطات کی توضیحی فہرستیں نو نو صفحات پر مشتمل ہیں۔ تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی کتابوں کے ساتھ ساتھ ترجموں اور لسانیاتی کتابوں پر بھی (بڑے) کام کے مقدمے لکھے گئے ہیں۔ اگر اس کتاب میں شامل مقدمات کو موضوع وار ترتیب دیا جائے تو یہ تقسیم کچھ یوں ہو گی۔

(۱) تذکرہ نگاری (۷)

(۲) لغات (۱۴)

(۳) لسانیات (۱۰)

(۴) فہرست مخطوطات (۶)

(۵) غالبیات (۶)

(۶) اقبالیات (۲)

(۷) تراجم (۱۱)

(۸) قدیم متون (۱۱)

(۹) مقالات پی۔ایچ۔ڈی (۶)

(۱۰) متفرقات (۳۳)

بیشتر مقدمات تنقید و تحقیق کے حوالے سے گراں قدر معلومات کے حامل ہیں۔ اور عالی کے خوبصورت انداز تحریر میں ڈھل کر دو آتشہ ہو گئے ہیں۔ ان کا یہ دلکش انداز نکتہ سرائی کا مظہر ہی نہیں ''یاران نکتہ داں'' کے لئے ''صلائے عام'' کا نقیب بھی ہے۔ دیکھیں:

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

(۲)

"عالی صاحب ہمارے دور کے سب سے بڑے اور قابل ذکر دیباچہ نگار ہیں۔ مولوی عبدالحق کے بعد علمی دیباچہ نگاری کی روایت انہیں کی وجہ سے تابندہ ہوئی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ عالی صاحب کی علمی و ادبی شخصیت کا موثر اظہار ہے۔ جس کے بارے میں اب تک سنجیدگی سے غور نہیں ہوا۔ اس مجموعے کی اشاعت سے ادب عالی کا ایک بالکل نیا اور بھرپور پہلو سامنے آتا ہے"۔(۹)

"حرفے چند" کا بحیثیت مجموعی مطالعہ ایک نئے معنوی افق کو جنم دیتا ہے۔ مقدمہ نگاری کی روایت میں عالی کا اندازِ نقد و نظر' سائنسی خطوط پر استوار ہے۔ اس میں کہیں بھی ڈھیل یا جھول نہیں۔ ان کی موضوعاتی گرفت اس قدر مضبوط ہے کہ پیش نظر تحریر کی غیر جذباتی اور سنجیدہ پرکھ خود اپنا اظہار بن جاتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے نوادارات کی دریافت دراصل کلاسیکی ادب کے باہمی ربط و ضبط کا ایسا بندھن ہے جو تاریخ کی روشنی میں نکھر کر خود روشنی کا استعارہ بن جاتا ہے اس سے کسی بھی ادب پارے کے مالہ و ماعلیہ براہ راست بحث و تمحیص کا موضوع بنتے ہیں۔ عالی کے ہاں اس تاریخی بازیافت اور تنقیدی شعور کے باہمی امتزاج سے ایک طرح کی انفرادی سوچ کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ جس کا اظہار "حرفے چند" میں شامل اکثر مقدمات میں ہوا ہے۔ غالب کے صد سالہ جشن کے موقع پر انہوں نے انجمن کی جن کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں وہ ان کے مخصوص رنگ تحریر کے اچھے نمائندے ہیں۔ اسی طرح انتخاب جدید (حصہ دوم) جو کہ معاصر شعراء کے انتخاب کلام پر مشتمل ہے' کا مقدمہ ایک خوبصورت بیانیہ ہے۔ اس میں کہیں کہیں کچھ کہنے' کچھ نہ کہنے کا انداز در آیا ہے لیکن وہ اس کی معنوی سطح کو مبہم نہیں کرتا بلکہ اس کا حسن بن جاتا ہے۔ جو اپنے قدرتی اور فطری پن کی وجہ سے روایت کے سلسلے کی ایک اہم کڑی بھی ہے اور لمحہ موجود میں اپنے دور کی شناخت کا باعث بھی---- عالی کے ہاں شناخت کا یہ تخلیقی تجربہ تہذیبی باطن میں غواصی سے ہاتھ آتا ہے۔ داخلی مناسبت سے خارجی اسالیب کا قرینہ لفظوں کے موجود و مافیہ سے تشکیل پاتا ہے۔ "کدم" اور "پدم" (۱۰) کی لفظی اور معنوی مناسبتوں کا تہذیبی تلازموں سے تعین ان کی مطالعاتی بوقلمونی کا مظہر ہے۔ انہوں نے تمدنی وحدت کا' متصوفانہ رنگ سے جو خاکہ مرتب کیا ہے وہ ان کی نگہ بازگشت کا کمال ہی نہیں برصغیر کی محسوساتی فضا میں لسانیاتی تناظر کی علامتی معنویت کا اجمالی جائزہ بھی ہے۔ ایسے تخلیقی پس منظر سے مقدمہ نگاری کی روایت ایک نئی سوچ سے

آشنا ہو جاتی ہے۔

عالی کے علاوہ یہ انداز کسی دوسرے مقدمہ نگار کے ہاں نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ بابائے اردو کے مقدمے بھی اس احساسِ نمو سے خالی ہیں۔ جو لاشعور کی تہہ داری بڑھ جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کے سفرناموں میں جو تخلیقی طرزِ احساس' مشاہدے کی وسعت اور کالموں میں جذباتی تہذیب کی فکری مناسبت' سے پیدا ہوتا ہے وہ بیک وقت "حرفے چند" کی علمی اور ادبی فضا کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ اس کا تجزیہ تخلیق تجربے کی ان ممکنہ نوعیتوں سے کیا جا سکتا ہے جو معنوی مماثلتوں کی حقیقت کا انتہائی نکتہ ہیں۔ جہاں لغات پر ان کے مقدمے لسانیاتی افق کو لفظ و معنی کی وابستگی سے نیا رنگ دیتے ہیں۔ وہاں بدلتی ہوئی قدروں کے تہذیبی احساس کو عکس و آہنگ کا منظرنامہ بنا دیتے ہیں۔ اس طرح اپنے عہد کی عصری حسیات لسانیاتی پس منظر میں ڈھل کر معنی خیز وحدت کا روپ دھار لیتی ہیں۔ جس سے لفظوں کی جمالیاتی چمک ماند نہیں پڑتی۔ اور گنجینۂ معنی کا طلسم ------ اس روش پر استوار ہوتا ہے جو تاریخ کے آئینہ خانے میں پریشان نظری کا امکانی رابطہ ہے۔ بنیادی طور پر عالی کے ہاں طرزِ احساس کی نموپذیری خارج و باطن کے مخلوط توازن سے عہدہ برآ ہوتی ہے جو ان کے مجموعی مطالعہ کے ممکنہ امکانات کے شعوری تجربے کا حصہ ہے۔ انہوں نے "حرفے چند" میں زبان کو صرف خیال اور فکر کی ترسیل تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے تخلیقی اور تشریحی انداز کی صورت گری کا اعزاز بھی بخشا۔ جو تجربے کے اظہار کی اکہری سطح پر رونما نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ترکیبی عناصر کی ماہیت ظاہر و باطن کے مجموعی تاثر کو سمیٹ لیتی ہے' جس سے کوئی بھی فن پارہ اپنے تمام تر فکری اور فنی تناظر میں ابھر آتا ہے اور یہ کسی بھی فنکار کے لئے صرف کامیابی کا ضامن ہی نہیں' زندہ رہنے کا مژدہ بھی ہے اور عالی اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان کے فن کی اسلوبیاتی دل بستگی اور فکر کی معنوی دلکشی اہل خبر سے پوشیدہ نہیں رہی۔ راہ دکھانے اور راستے کا پتہ دینے والے ہمیشہ کمیاب ہوتے ہیں۔ مشفق خواجہ نے ٹھیک کہا ہے کہ:

"راستہ دکھانے والے اور منزلوں کی نشاندہی کرنے والے کم ہوتے ہیں۔ عالی صاحب کی دیباچہ نگاری میں راہ دکھانے کی کیفیت بدرجہ اتم موجود ہے"۔(۱۱)

"حرفے چند" میں علمی اور تحقیقی امتیاز کا جو معیار ظاہر ہوا ہے' وہ دراصل تاریخ اور ماحول کے اس تانے بانے کا مظہر ہے جو آفاقی قدروں کی تلاش سے عبارت ہے۔ انسانی تہذیب کا تدریجی ارتقاء انسان شناسی کے اس اجتماعی شعور کی دین ہے جو حال کے قافلے کو

مستقبل کا ہم رکاب بنا دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ تہذیبی رویے جو عصری تاریخ سے نا آشنا ہوتے ہیں، ان کی مرکزیت کی فکری نمو رک جاتی ہے۔ افادیت میں توازن اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب زاویہ نظر کا غالب رجحان اجتماعی شعور کی بازیافت ہو اور یہ سلسلہ قدیم اور جدید رنگ کے باہمی رشتہ افکار سے منسلک ہے۔ کلاسیکی ادب کی بازیافت سے جدید ادب کی پہچان تک کا ادبی سفر نامہ منطقی تجربے کی کارگزاری کا منظر نامہ ہے۔ مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کے مقدمے کو "ابن انشاء------ احوال و آثار" کی مقدماتی جدول سے ملا کر پڑھیے تو فکری اساس کی اس ارتقائی صورت کا اندازہ ہوتا ہے جو اسلوب اور موضوع کی عمومیت کو شخصی اور ذاتی واردات سے دور نہیں جانے دیتی۔ اس طرح تخلیقی نوعیت اور فکری کیفیت محدود اور لا محدود کے درمیان ایک سنگم بن جاتی ہے۔

حواشی :

۱۔ حرفے چند، ص ۵۱۸، انجمن ترقی اردو، کراچی، بار اول، ۱۹۸۸ء

۲۔ جمیل الدین عالی سے راقم مقالہ کی گفتگو، ۲۹۔ نومبر ۱۹۹۱ء، بمقام حبیب بینک پلازا، کراچی

۳۔ انجمن کی کتابوں پر عالی اسی عنوان سے مقدمہ لکھتے ہیں۔

۴۔ جمیل الدین عالی سے راقم الحروف کی ملاقات، ۷۔ دسمبر ۱۹۹۱ء، کراچی

۵۔ تبصرہ بر "حرفے چند" ص ۴۹۹، ماہنامہ اوراق، لاہور، جون/جولائی ۱۹۸۹ء

۶۔ مشفق خواجہ، مقدمہ، ص ۲۱، حرفے چند مصنفہ جمیل الدین عالی

۷۔ مقدمہ، ص ۱۱، جمیل الدین عالی، حرفے چند

۸۔ مشفق خواجہ، مقدمہ ص ۹، جمیل الدین عالی، حرفے چند

۹۔ یک صفحاتی مقدمات: ۹

دو صفحاتی مقدمات: ۳۸

سہ صفحاتی مقدمات: ۱۶

چہار صفحاتی مقدمات: ۱۱

پنج صفحاتی مقدمات: ۷

شش صفحاتی مقدمات: ۳

ہفت صفحاتی مقدمات: ۲

ہشت صفحاتی مقدمات: ۳

یازدہ صفحاتی مقدمات: ۱

دوازدہ صفحاتی مقدمات: ۲

سیزدہ صفحاتی مقدمات: ۱

چہاردہ صفحاتی مقدمات: ۱

پانزدہ صفحاتی مقدمات: ۱

ہفدہ صفحاتی مقدمات: ۱

بست و چہار صفحاتی مقدمات: ۱

۱۰۔ مشفق خواجہ، مقدمہ، ص ۲۲، جمیل الدین عالی، حرفے چند
۱۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتبہ کتاب "کدم راؤ پدم راؤ" پر عالی کا مقدمہ دیکھئے، ص ۱۱۷، حرفے چند مصنفہ جمیل الدین عالی
۱۲۔ مقدمہ، ص ۲۰، جمیل الدین عالی، حرفے چند

نثر نگاری کی دوسری جہتیں
اور عالی

(۱)

جمیل الدین عالی کی نثر نگاری کا آغاز زمانہ طالب علمی میں ہوا۔ اینگلو عربیک کالج دلی کے مجلہ "کاروان" ۴۳۔ ۱۹۴۲ میں ان کی پہلی نثری کاوش شائع ہوئی۔ جس کا عنوان تھا "کافی ہاؤس میں" ------ عالی بتاتے ہیں کہ:

"ان دنوں میرا رجحان زیادہ تر شاعری کی طرف تھا۔ اس لئے دوھے اور غزل پر زیادہ توجہ رہی۔ نثر میں اس مضمون کے علاوہ' جو کالج میگزین میں چھپا' شاید ایک آدھ تحریر اور بھی ہو لیکن اس وقت یاد نہیں...... "کافی ہاؤس میں" انشائیہ نما تحریر تھی جو ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں لکھی گئی تھی"۔(۱)

(۲)

عالی کی قدیم ترین نثری تحریر' جس تک ہماری رسائی ہو سکی "وہ مغموم آنکھیں" ------ کے عنوان سے ماہنامہ "ساقی" کراچی میں چھپی۔ بعد میں یہ ان کے شعری مجموعے "غزلیں' دوھے' گیت" کے آخر میں شامل ہوئی۔ حقیقت اور افسانے کے امتزاج سے اس کہانی کا خمیر گوندھا گیا۔ ذاتی واردات جب تخلیقی تجربے سے آشنا ہوئی تو اس نے جرات اظہار کا لبادہ اوڑھ لیا------ یہ کہانی کوئی نئی نہیں' کئی اور افسانہ نگاروں کے ہاں بھی ایسے کردار مل جائیں گے' لیکن جو چیز عالی کا کمال ہے وہ ان کی بنت کاری ہے۔ انہوں نے شدت تاثر کو جس طرح "مدھم سروں" میں سمویا ہے وہ اردو افسانے میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے بقول:

"تقسیم ہند کے پس منظر میں لکھے گئے "تیز" اور "شدید" افسانوں سے مختلف، مدھم سروں کی اس کہانی کا امتیاز، موضوع سے قطع نظر، ٹریٹمنٹ اور تجربے کی جرات میں مضمر ہے------ "وہ مغموم آنکھیں" کے عنوان سے ہے۔ جمیل الدین عالی کی یہ کہانی نظمیہ نثر نہیں، یہ اول تا آخر رواں نثر میں ہے لیکن یہ پوری کی پوری "فعولن فعولن" میں لکھی گئی ہے۔ اس میں نظم کی گرائمر کہیں نہیں لیکن یہ ردھم میں ہے اور اپنی قرات کے لئے بلند خوانی کا تقاضا کرتی ہے۔

اردو میں اتنے بڑے پیمانے پر، یہ پہلا اور ان کے باوجود بڑا کامیاب تجربہ ہے جو عالی صاحب کے اعتماد ذات اور علم عروض سے ان کے مدت العمر کے ماہرانہ اور محرمانہ تعلق پر دلالت کرتا ہے .... یہ کہانی ۱۹۵۲ء میں لکھی گئی۔ (اب اس پر چالیس برس ہونے کو آئے) اس بھرپور اور نادر تجربے کی پیروی ہونا ابھی باقی ہے۔

"کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق!"(۲)

(۳)

عالی کی ایک اور نثری جہت ان کی اداریہ نویسی ہے۔ انہوں نے ماہنامہ "ہم قلم" کراچی میں (جو ۱۹۶۱ء میں نکلنا شروع ہوا)، اداریئے لکھے۔ ان میں سے بیشتر اداریئے ادیبوں کے مسائل سے متعلق ہیں۔ غالبا وہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے عملی طور پر ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کیا۔ ادیبوں کے حقوق کے تحفظ اور کاپی رائٹ کے قانون کے سلسلے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ "ہم قلم" کے علاوہ ماہنامہ "قومی زبان" کراچی، کے متعدد شماروں کے لیے عالی نے اداریئے تحریر کئے ہیں۔ بقول ان کے:

"صرف وہی (اداریئے) میرے ہوتے ہیں جن پر معتمد اعزازی کے طور پر میرا نام آتا ہے"۔(۳)

اداریوں میں بھی ان کی دیگر تحریروں کی طرح موضوعاتی اور فکری ہمہ جہتی کا اظہار ہوا ہے۔ بعض اوقات ان کے "اظہاریے" ہی بطور اداریہ شائع ہوئے ہیں۔ ادب میں جدید رجحانات، پاکستانیت اور عصری حسیات سے لے کر ٹیکنالوجی اور مستقبلیات تک سارے موضوعات ان کے اداریوں کا فکری منظر نامہ ترتیب دیتے ہیں۔ ان اداریوں کے مطالعے کے مجموعی تاثر سے عالی کی جو تصویر بنتی ہے وہ اس دانشور عالی کی ہے جو مشرق اور مغرب کے افکار عالیہ سے اردو کی مانگ میں سیندور بھرتا ہے۔ وہ گیسوئے اردو کو محض احساس کے شانوں

پر ہی نہیں بکھیرتا بلکہ فکر کی داخلی آرائش سے اندیشہ ھائے دور دراز کو بھی سنوار دیتا ہے۔

(۴)

"نئی کرن" عالی صاحب کا پہلا نثری کتابچہ ہے۔ جو ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ یہ کوئی ادبی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کا موضوع بنیادی جمہوریت تھا۔ اس حوالے سے بعض لوگ معترض ہوئے کہ اس کتاب میں صدر محمد ایوب خان کے مارشل لاء سے اچھی توقعات وابستہ کی گئیں : ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول:

"(اس) میں مارشل لاء کی حمایت کی گئی تھی"۔(۴)

میں نے جب اس سلسلے میں عالی صاحب سے استفسار کیا تو انہوں نے مجھے لکھا:

"میں اسے (نئی کرن کو) Disown نہیں کرتا۔ افسوس کرتا ہوں کہ اس میں باندھی ہوئی امیدیں کم پوری ہوئیں"۔(۵)

وہ کیا امیدیں تھیں جو مارشل لاء سے باندھی گئیں؟ ان میں کہاں تک کامیابی ہوئی اور اس کامیابی میں "نئی کرن" نے کیا کردار ادا کیا؟ عالی صاحب ہی سے سنیے:

"نئی کرن" ایک پمفلٹ نما کتاب تھی۔ موضوع تھا صدر ایوب مرحوم کے مارشل لاء کے ابتدائی اچھے تاثرات، اس اپیل کے ساتھ کہ سرکاری ملازموں کو قانونی کاروائی کے بغیر برطرف نہ کیا جائے اور انہیں اپیل کا حق بحال ہونا چاہئے (اس وقت یہ ایک بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا) اس کتاب کے چھپنے کے بعد جو صدر مرحوم کی نظر سے گزروائی گئی، اپیل کا حق بحال کر دیا گیا اور سینکڑوں غریب ملازمین کی نوکریاں بچ گئیں۔ بہرحال یہ ایک مختصر سی کتاب تھی اس میں سیاست دانوں کی نازیبا حرکات، ان کے سرکاری اخراجات وغیرہ پر کچھ جارحانہ تبصرہ تھا اور امید ظاہر کی گئی تھی کہ مارشل لاء حکومت ایسا نہیں کرے گی"۔(۶)

(۵)

عالی صاحب حسب ذیل تین کتابوں کے ترجموں میں بطور شریک مترجم شامل رہے:۔

۱۔ شنگھائی کی عورتیں(۷)

۲۔ ایشین ڈرامہ (۸)

۳۔ جدید اقتصادی اصطلاحات (غیر مطبوعہ)

"شنگھائی کی عورتیں" سویڈش ڈرامہ نگار تورے زتیر ہولم کی کتاب ہے۔ جس کا عالی نے افضل صدیقی (مدیر روزنامہ "امن" کراچی) کے ساتھ مل کر ترجمہ کیا۔

"ایشین ڈرامہ" ڈاکٹر گنار مر ڈال کی کتاب (ملخص) An Approach to Asian Drama کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا زیادہ تر ترجمہ ابن انشاء کے قلم سے ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور مترجمین بھی شریک کار رہے ہیں۔ عالی نے نہ صرف اس کام کی نگرانی کی بلکہ وہ ترجمے کے کام میں بھی شامل تھے۔ خود ان کے بقول:

"میں نے اس کی مخصوص نوعیت کے سبب اسے درست کیا۔ دو ابواب خود ترجمہ کئے۔ اس پر کسی کا نام' خاص طور سے اپنا نام اس لئے نہیں دیا گیا کہ (انتظامیہ) کا فیصلہ تھا کسی تنخواہ دار کا نام بطور مترجم نہ دیا جائے اور میں اس وقت ان کا ایگزیکٹیو وائس پریذیڈنٹ تھا------ اس کی سطر سطر میری دیکھی ہوئی ہے۔ بے شمار تصحیحات و ترمیمات ترجمہ میری ہیں مگر وہ اصولاً تمام کام میرے کریڈٹ میں نہیں جانا چاہئے کیوں کہ سارا کام (اوریجنل کام) میں نے نہیں کیا"۔(۹)

تیسرا ترجمہ جو "جدید اقتصادی اصطلاحات" پر مشتمل ہے ابھی شائع نہیں ہوا۔ یہ بھی اپنی طرز کا ایک خوبصورت کام ہے جس سے وہ عہدہ برآ ہوئے ترجمے کا فن اپنے مترجم سے جس انہماک اور ہردو زبانوں پر جس درجہ مکمل گرفت کا تقاضا کرتا ہے' عالی اس سے متصف ہیں۔ ان کی زبان رواں دواں اور اسلوب اظہار' واضح اور نکھرا ہوا ہے۔ زبان کی سادگی' خیال کی ترسیل کے لئے بہت ضروری ہے۔ یہ ایک ایسی اضافی خوبی ہے جس کا عالی کے تراجم میں بالخصوص مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

(۶)

مکتوب نویسی اظہار کا آسان ترین راستہ بھی ہے اور مشکل ترین بھی------ کیوں کہ اس میں مخاطب سے ہم کلامی دراصل اپنی ذات کے مختلف گوشوں تک رسائی کا ہی دوسرا نام ہے۔ اپنے باطن میں سفر ایک صوفیانہ عمل ہے جب کوئی بھی شخص اس عمل سے گزرتا ہے تو تخلیقی تجربہ اس کے اظہار ذات کو گنجینہ معنی کا نگارخانہ بنا دیتا ہے۔ شخصی طرز احساس کی اس وسعت پذیری کا اندازہ ہمیں غالب کے خطوں میں ہوتا ہے اور یہ رجحان جب جمیل الدین عالی تک پہنچتا ہے تو ذات کی فکری معنویت کا بلیغ استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اگرچہ عالی کے ہاں جذبے کی یہ رو تخلیق کی اکہری سطح پر رونما ہو رہی ہے لیکن ان کا انداز اس قدر جاذب نظر ہے کہ تجربے کے اکہرے پن کا کم ہی گمان گذرتا ہے۔

اگر یہ خط کبھی کتابی صورت میں چھپ سکے تو اپنے عہد کا ایک اہم تجزیاتی مطالعہ ہوں

گے۔ خاص طور پر وہ خط' جو ان کے (بہت) قریبی دوستوں کے نام ہیں' معرکے کی چیزیں ہیں۔ اگر چہ خود ان کے بقول:

"ظاہر ہے ایسے خطوط برائے اشاعت نہیں ہوتے یعنی صاحب تحریر کی زندگی میں نہیں چھاپے جا سکتے' یوں بھی اس میں کیا کمال ہے اور ابھی میں اس قابل کہاں (یہ "ابھی" بھی خوب آیا' گویا ابھی کچھ اور ممکن ہے!) کہ لوگ میرے خط چھپوائیں"۔(۱۰)

(۷)

"انجمن نے بابائے اردو کے بعد سے اب تک ڈھائی سو کے قریب چھوٹی بڑی کتابیں چھاپی ہیں۔ جن میں سے اکثر مخطوطات دکنیات پر بھی مشتمل ہیں۔ عالی صاحب نے پاکستانی مخطوطات بھی لئے اور قدیم بھی' عصری پشتو' سندھی' پنجابی ادب کے تراجم بھی کرائے اور چھاپے' ان اڑہائی سو کتابوں پر انہوں نے مختصر اور بعض تفصیلی دیباچے لکھے"۔(۱۱)

ایک سو چار کتابوں پر لکھے گئے مقدمات "حرفے چند" میں شامل ہیں۔ بقیہ ڈیڑھ سو کے قریب مقدمے دوسری جلد کے متقضی ہیں۔ عالی کا سب سے بڑا مقدمہ ابن حسن برنی کی کتاب "البیرونی" پر ہے۔ جس میں ان کا تحقیقی اور تنقیدی نقطہ نظر (بڑی) خوبصورتی سے نکھر کر سامنے آیا ہے۔ مختصر مقدموں میں بھی ان کا انداز تحریر اپنی دلکشی کی بہار دکھاتا ہے۔ سچائی تک پہنچنے کا طریقہ ان کے ہاں اس وجدانی کیف کا اعجاز ہے جو زندگی کے معروضی طرز احساس سے نمو پاتا ہے۔

(۸)

عالی کی اظہاریہ نویسی کا آغاز ۱۹۶۷ء میں ہوا۔ ۱۹۷۸ء تک کے گیارہ سالہ اظہاریوں کا ایک موضوع وار انتخاب دو جلدوں میں شائع ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک کے اظہاریے روزنامہ جنگ کے ہفتہ وار صفحات میں بے طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر یہ "کلیات" کی صورت میں چھپ جائیں تو موضوعاتی اور فکری تنوع کا اتنا بڑا ذخیرہ کہیں اور نہیں ملے گا۔ ویسے بھی معنوی سطح پر جو گیرائی اور گہرائی ان کے اظہاریوں کا امتیاز ہے' کسی اور کے ہاں دکھائی نہیں دیتی۔ کلاسیکی قدروں کے زیر اثر ان کا نقطہ نظر مقصدی ابلاغ کا بہت خوبصورت بیانیہ ہے۔

بین الاقوامی پیش منظر پر پاکستانیت کا فروغ ان کا وظیفہ خیال ہی نہیں وظیفہ حیات بھی ہے۔ وہ جب مختلف حوالوں سے پاکستان کے قومی تشخص کو ابھارتے ہیں تو اس تشخص کا مستقبل کے ساتھ رابطہ خوش نمائی کا وہ منظر نامہ تخلیق کرتا ہے جو ان کے فکری دائرے کو

تکمیل سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اس طرح ان کے ہاں یکسانیت پیدا نہیں ہوتی کیوں کہ "مستقبلیات" کا معنوی دائرہ اتنا وسیع ہے کہ انسان کی بقا' احساس کی اس جدلیاتی وحدت سے وابستہ رہتی ہے جو عصری آگہی کو حیاتی تلازموں سے تعبیر کرتی ہے۔

(۹)

غالب نے کہا تھا:

بقدرِ شوق نہیں ' ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

غالب کو ادائے مطلب کے لئے " تنگنائے غزل " میں "کچھ اور وسعت" کی آرزو تھی' ان کی اس آرزو نے جب عالی کی صورت میں صورت گری کی تو طبیعت کی روانی " تنگنائے غزل" سے نکل کر اظہار کی مختلف جہتوں میں ذوق سفر سے آشنا ہوئی کیوں کہ مدعا کی ترسیل سے تفہیم تک کا عمل وجدان کے جس گہرے شعور کا تقاضا کرتا ہے وہ عالی کے گلدستہ فکر میں خوش نما پھولوں کی طرح تر و تازہ ہے۔ بقول اختر امان :

"(عالی) دانشور' ادیب اور کالم نگار ہیں------ادیب' دانشور وغیرہ اور بھی ہیں جن کا معاملہ "ادھر ڈوبے ادھر نکلے" والا بھی ہے۔ لیکن جمیل الدین عالی کے ہاں غالباً طلوع کا وقفہ طویل تو ہے کہ ادھر نکلے اور بس پھر نکلے ہی رہے ...... اگر ہم اپنے ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکری لے کر کھڑے ہو جائیں اور ان کے متعدد کارناموں پر ان کے اوپر پھول برسائیں تو ادب کے میدان میں ان کے کئی کارنامے ایسے ہوں گے جو شاید شمار میں ہی نہ آ سکیں گے"۔(۱۲)

حواشی :

۱۔ راقم الحروف سے گفتگو' ۷۔ دسمبر ۱۹۹۱ء' ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی' کراچی
۲۔ غزلیں' دوہے' گیت' سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور' ۱۹۹۲ء
۳۔ مکتوب عالی بنام راقم مقالہ' ۲۔ مارچ ۱۹۹۲ء
۴۔ طاہر مسعود سے گفتگو' روزنامہ جسارت' کراچی' ۲۸۔ مئی ۱۹۸۲ء
۵۔ مکتوب عالی بنام راقم' ۲۳۔ ستمبر ۱۹۹۱ء
۶۔ مکتوب عالی بنام مقالہ نگار' ۲۳۔ ستمبر ۱۹۹۱ء

۷۔ مکتبہ الفتح، کراچی، ۱۹۷۲ء

۸۔ نیشنل بینک آف پاکستان، کراچی

۹۔ مکتوب عالی بنام راقم، ۲۔ مارچ ۱۹۹۲ء

۱۰۔ مکتوب عالی بنام ڈاکٹر سید معین الرحمن، ۱۹۔ ستمبر ۱۹۸۶ء

۱۱۔ عرض ناشر، صدا کر چلے، ص (ذ)

۱۲۔ سات رنگ، نصرت پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۹

عالی کا فکر و فن
ایک نگہ باز گشت

(۱)

"نثر نگار کی حیثیت سے عالی صاحب جن مختلف جہتوں میں نظر آتے ہیں۔ وہاں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت کے نقوش ثبت کئے ہیں...... عالی صاحب قدیم و جدید کا وہ سنگم ہیں جہاں سے ادب اور زندگی دونوں کی معنویت اور ہمہ گیری کا ایک نیا احساس ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے"۔(۱)

جمیل الدین عالی کے ہاں اپنی ذات کی مختلف جہتوں میں سفر دراصل اس تشخص کی معنویت کا شناخت نامہ ہے جو "پاکستانیت" کے فروغ اور "مستقبلیات" کے فکری احساس کی تمہید ہے۔ تہذیبی پس منظر میں عصری مسائل اور رجحانات کی صورت گری' اجتماعی شعور کا تجزیاتی حوالہ ہے۔ "پاکستانیت" کے فکری افق پر تخلیقی تجربے کی جو بنت کاری دکھائی دیتی ہے وہ مقصدیت کے گہرے تفکر کا لازمہ ہی نہیں' بنیاد بھی ہے۔ اس سے ان کی تخلیقی اپچ' تازگی احساس کے اس فکری منظرنامے کو ترتیب دیتی ہے جو ان کے ہاں شخصیت نگاری سے اظہاریہ نگاری تک پھیلا ہوا ہے۔

(۲)

"عالی کے قلم میں بلا کا زور اور توانائی ہے۔ وہ جتنے عمدہ شاعر ہیں اتنی عمدہ نثر بھی لکھتے ہیں۔ ان کی نثر کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ پڑھنے والا اس میں گم ہو جاتا ہے اور وہ بیچ بیچ میں دلچسپ داستانیں نہایت موثر انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس سے قاری کو

اکتاہٹ ذرا بھی محسوس نہیں ہوتی بلکہ اس کے پڑھنے کا اشتیاق اور بڑھ جاتا ہے"۔(۲)

عالی کے سفرناموں میں ماضی کی بازیافت سے مستقبل کی فکری ہمہ جہتی کا وہ منظر دکھائی دیتا ہے جو اپنی ذات کے شخصی گوشوں سے نکھر کر تخلیقی تجربے کا حصہ بنتا ہے۔ ان کے باطن کی خوشبو جب پردہ احساس سے ٹکراتی ہے تو اس سے منظر نگاری کا فن ڈرامائی کیفیات سے مل جاتا ہے جو تجربے کی محسوساتی فضا کو داخل کے کشفی ماحول کا بیانیہ سمجھ کر زندگی کی مختلف جہتوں میں محو سفر رکھتی ہیں۔ اس سے اجتماعی فکر، تاریخی شعور سے ہم آہنگ ہو کر معاشرتی تقاضوں کی پہچان بن جاتی ہے۔ جس سے عالی کا تخلیقی سفر اپنے شوق کی بے پایاں وسعتوں سے ہمکنار ہوتا ہوا آکاش کی دھنک رنگ فضا تک پھیل جاتا ہے۔ "تماشا مرے آگے" میں ان کا قلم بعض مقامات پر ایسے منظر تخلیق کرنے لگتا ہے جو شاعری میں ان کے لاشعور کا بے ساختہ اظہار ہیں۔

بقول محمد عزیز خان:۔

"ان کے سفرنامے..... لوگوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مشاعروں میں تازہ غزل یا دوہے کے بجائے، سفرنامہ سنانے کی فرمائش کی جاتی ہے"۔(۳)

"تماشا مرے آگے" اور "دنیا مرے آگے" کی فکری سطح جب "آئس لینڈ میں چند روز" کی معنوی فضا سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو رعنائی خیال کی رجحان سازی مشاہداتی ہمہ رنگی کو سمیٹ لیتی ہے۔ جس سے خارج و باطن کا مجموعی رنگ اپنی ماہیت کی متصوفانہ اوٹ سے چہرہ نمائی کرتا ہے۔ عالی کے سفرناموں میں جہاں بھی یہ انداز دکھائی دیتا ہے وہ حصے اپنے فکری تموج کے لمحاتی گداز کا اشاریہ ہیں۔ کیوں کہ یہ طریقِ کار اپنی ذات کے انکشاف سے بڑھ کر حسنِ مطلق کی تلاش کا نقطۂ آغاز بن جاتا ہے اس سے سفرناموں کی فکری سطح آئینہ سازی کے عمل کی تمثیلی توجیہہ بن کر سامنے آتی ہے۔

(۳)

"عالی صاحب پاکستان کے ان چند کالم نویسوں میں سے ہیں، جنہوں نے ربع صدی سے زیادہ عرصے سے اس دشت کی سیاحی اختیار کر رکھی ہے۔ اخباری کالم جیسی وقتی اور ہنگامی چیز کو انہوں نے دوامی اور مستقل حیثیت دے دی ہے۔ عالی صاحب کے کالم کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان کتابوں کی ایک اپنی مستقل اہمیت ہے۔ ان کی کالم نویسی کی ایک نمایاں خصوصیت غیر معمولی وطن دوستی اور اپنے وطن کے افتخار کو نمایاں کرنا ہے۔ عالی

صاحب کی وطن دوستی جزوِ ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ اس خصوصیت نے ان کی کالم نویسی کو بے شمار نئے افق عطا کئے ہیں"۔(۴)

عالی کی اظہاریہ نویسی اپنے عہد کی استعاراتی بوقلمونی کا ایسا مرقع ہے۔ جس سے جہد حیات کی وسعتیں اپنے فکری عمل سے مملو ہوتی ہیں۔ ان کے تخلیقی سرمائے میں معنوی سفر دراصل ان جہتوں کا عرفان حاصل کرنے کے مترادف ہے جو سماجی حوالوں سے ان کے مشاہدے کا حصہ ہیں۔ موضوعاتی تنوع سے فکری گہرائی تک کا منظرنامہ زندگی کی ان قدروں سے مستعار ہے جو لمحہ موجود میں اپنے طبیعاتی احساس کا اساسی پہلو ہیں۔ تاریخی شعور کی لمحاتی بنت میں مستقبلیات کی آشنا پذیری ان کی دوراندیشی کا ایسا بیانیہ ہے جو ان کے انفرادی طرز احساس سے جنم لیتا ہے۔ جذباتی کیفیات کی بلند آہنگی جب اجتماعی سطح پر اپنے عہد کا تصویری خاکہ بناتی ہے تو مستقبل کا روشن چہرہ اپنے تخلیقی تجربے کی لودے اٹھتا ہے۔ "گمان سے یقین" تک کا فکری سفر اسی تجربے کا مرہون منت ہے۔ اس سے عالی کی سوچ "مستقبلیات" جیسے رجحان ساز احساس سے آشنا ہوئی ہے۔ "صدا کر چلے" اور "دعا کر چلے" کے علاوہ ان کے غیر مدون اظہاریوں میں بھی اس عمل کی تہذیبی معنویت کا گمان گزرتا ہے۔ جب وہ اپنے عہد کے اجتماعی تشخص کو تاریخی حوالوں سے دریافت کرتے ہیں تو ان کے ہاں غالب کا سا انداز دکھائی دیتا ہے جو ذات کی داخلی جہتوں سے منعکس ہو رہا ہے۔ اس حوالے سے بالیدگیٔ فکر کا جو استعارہ بنتا ہے وہ اسی انفرادی طرزِ اظہار کا نتیجہ ہے جو ذہنی سفر کے امکانی زاویہ نگاہ سے براہ راست وابستہ ہے۔ عالی کے ہاں تخلیقی عمل کا یہ شعوری رابطہ معنوی تہہ داری کا مظہر ہے۔ زندگی کی تہذیبی اور تاریخی اقدار عصری رجحانات کے تناظر میں ارتباط دانش' کے فلسفیانہ احساس کی بنیاد ہیں۔ جو معاشرے کے فکری عناصر کو سمجھنے کے لئے شعوری ادراک کا بنیادی درجہ ہیں۔ اس طرح لاشعور کی علامتی معنویت کسی منفی پہلو سے مملو نہیں ہوتی۔ کیوں کہ لمحاتی تشخص کا احساس بھی اسی جہت کا اظہاریہ قرار پاتا ہے جو شخصی طریق کار کے جذباتی پن کی عکاسی ہے۔ عالی کے تخلیقی سرمائے میں اس عمل کا تہذیبی پس منظر اتنا نمایاں ہے کہ اس پر ذاتی تجربے اور مشاہدے کی جھلک اپنے فکری دائرے کی موضوعاتی بنت کا داخلی اظہار بن جاتی ہے۔ نظریاتی حوالے سے عالی کا فکری کینوس' دراصل جذباتیت کا وہ اثاثہ ہے جو ان کی تخلیقی معنویت کو تجزیاتی احساس کے حسیاتی پس منظر میں اجاگر کرتا ہے۔

(۴)

"موضوعات کی انفرادیت گہرے مطالعے اور اظہار کی قوت کا مطالبہ کرتی ہے۔ تنقید' تحقیق' فلسفہ' لسانیات' منظومات اور دیگر علمی و ادبی موضوعات کی کتب پر حرفے چند لکھنا فکر و اظہار کا امتحان بن جاتا ہے۔ اس طرح ایک جہان معنی ہے جو عالی صاحب کے زیر قلم آتا ہے اور وہ ہر موضوع سے حتی الامکان انصاف کرتے ہیں' ان کی زبان موضوع سے مطابق ہوتی ہے۔ بعض اوقات ان کی یہ تعارفی تحریریں ایک قسم کا خلاصہ یا مقاصد تالیف و تصنیف کا منشور بن جاتی ہیں۔ وہ موضوع کتاب سے متعلق اہم نکات بیان کر کے قاری کی مشکل آسان کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کا یہ رویہ تنقیدی ہو جاتا ہے۔ وہ کتاب کی خامیاں' کوتاہیاں اور کتابت و طباعت کے اسقام بھی بتا دیتے ہیں۔ البتہ مصنف یا مولف کتاب ان کی نظر میں ہمیشہ محترم ٹھہرتا ہے۔ یہ ان کی فکر کا احترامی انداز ہے۔ یہ ان کی خصوصیت ہے اور وہ اس ضمن میں اپنے انداز تحریر سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ وہ فضیلت ہے جو ہر خامہ فرسا ادیب کو نصیب نہیں"۔(۵)

عالی کی مقدمہ نگاری دراصل سچائی کی تلاش کا وہ معنی خیز پیش منظر ہے جو تاریخی فکر کو محسوساتی زاویوں کی ایسی بنیاد فراہم کرتی ہے جس سے دریافت کا عمل اپنے تہذیبی شعور میں سفر کرتا ہوا حال کے منظر نامے پر مستقبل کی پذیرائی کا موضوعاتی رابطہ بن جاتا ہے۔ لسانیاتی پس منظر میں معنویت کی دوہری سطح اس شعوری گمبھیرتا سے وابستہ ہے جو لفظ و معنی میں حک و اضافے کو اپنے فطری عمل سے آشنا کر دیتی ہے۔ اس سے عالی کا فن گمشدہ کڑیوں کی بازیافت تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ تاریخی عمل کی مختلف جہتوں میں سفر کرتا ہوا اس فکری تسلسل کا حصہ بن جاتا ہے۔ جو کسی بھی عہد کی بو قلمونی کو سمجھنے کے لئے ناگزیر ہے۔ عالی نے عصری تقاضوں کو معنوی طرز احساس سے ہم آہنگ کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ جس سے توازن کی یہ کیفیت' علائم و رموز کے بجائے توضیحاتی حسیات کا دیباچہ قرار پاتی ہے۔ اس سے ادبی روایت اپنی فکر کے اس ثقافتی دھارے سے متعلق رہتی ہے جو تہذیبی حوالے سے اپنی علیحدہ اور منفرد حیثیت کا احساس رکھتا ہے۔

مقدمہ نگاری کے ضمن میں عالی کا (مجموعی) انداز نظر تشریحی نوعیت کا ہے۔ ان کا قلم جب اپنے مخصوص طرز سے لفظوں کے ہالے بناتا ہے تو تہذیبی پس منظر' معنویت کی تخلیقی اکائی سے نکھرتا ہے۔ کیوں کہ بازیافت کا عمل زندگی کی بنیادی قدروں سے لے کر تاریخ کی

پنہائیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی لئے عالی کے ہاں کسی طرح کا فکری تضاد دکھائی نہیں دیتا وہ جب بھی اپنے تخلیقی تجربے کو تاریخی شعور سے ابھارتے ہیں تو ان کے مقدموں میں لمحہ موجود' حسیاتی مشاہدے کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ جس سے ندرت اظہار کی نیرنگی اپنے ذہنی طرز احساس کا معروضی حوالہ بنتی ہے۔

"ان کے طرز احساس میں شاعرانہ لطافت و نزاکت کو زیادہ دخل ہے۔ لیکن انہوں نے ہر لکھے جانے والے لفظ کی عظمت و اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا اور اسے تحفظ فراہم کرنے میں پوری کوشش کی"۔(٦)

(۵)

عالی کے شخصی خاکوں میں (ان کا) انداز بیاں اپنی جذباتیت کو فکر کی موضوعاتی سنجیدگی سے ملا دیتا ہے جس سے ان کی اپنی ذات اجتماعی تناظر میں بکھر کر ہم کلامی کے وجدانی تجربے میں تحلیل ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود خوشبوئے بدن کی پذیرائی کا احساس جاگتا ہے۔ تلاش ذات کا یہ روحانی عمل جب وسعت سے ہمکنار ہوتا ہے تو سائل دھلوی' اختر الایمان اور صوفی تبسم کے خاکے وجود میں آتے ہیں۔ عالی کے ہاں خود پرستی کا عمل اس مقام کی طرف ارتقاء پذیر ہے' جہاں انکسار ذات کا صوفیانہ عمل امکانی رابطے کو فکری زاویے کی مکالماتی توجیہہ بنا دیتا ہے۔ کسی بھی شخصیت کی معنوی تلاش تخلیقی لمحوں کی منت آشنائی کے مترادف ہے کیوں کہ جس طرح خیال کی تجسیم نگاری لفظوں کے لمحاتی گداز سے منکشف ہوتی ہے اسی طرح چہرہ نمائی کا عمل باطن کی غواصی سے سامنے آتا ہے۔ عالی کسی بھی شخصیت کے ظاہری خدوخال کی زیبائی کا پیکر نہیں تراشتے بلکہ وہ حسن درون ذات سے چہروں کے اجالنے کا کام لیتے ہیں۔ اسی لئے وہ شخصیت نگاری میں ان کے حسی رویے' تخلیقی اظہار کی شخصی مدھرتا کو جذبے کی فراوانی سے ہم آہنگ رکھتے ہیں۔ وہ پیش نظر شخصیت کو موضوعی تناظر میں پھیلا کر عصری ہمہ جہتی کے منظر نامے میں سمو لیتے ہیں۔ اس طرح (اس) شخصیت کا شخصی مطالعہ زندگی کی ان قدروں کا اظہار بن جاتا ہے جو ماحول کی پروردہ ہوتی ہیں۔ انہوں نے اختر الایمان (۱۹۵٦ء) سے ابن انشاء (۱۹۷۹ء) تک جتنے بھی خاکے لکھے ہیں' ان میں موضوعی مشاہدے کا دوھرا پن در آیا ہے۔ جو اظہار سے ابلاغ تک مراقبہ فکر کی جمالیاتی صداقت کا خوبصورت بیانیہ ہے۔ اس سے پیش نظر شخصیت کا (لفظی) خاکہ معنویت کی اس ہمہ رنگی سے ماخوذ ہوتا ہے جو لاشعور کے تخلیقی پن کا عکس ہے۔

تلاش ذات کا وہ عمل جو عالی کے سفر ناموں میں اپنی تہذیبی اکائی کے دامن سے پھوٹتا ہے۔ شخصی خاکوں میں لمحوں کی فکری تشکیل سے جنم لے رہا ہے۔ دراصل اس کے پیچھے احساس جمال کا وہ رد عمل کارفرما ہے جو نگار خانے میں حسن کی علامتی معنویت کا فطری پہلو ہے۔

(٦)

عالی کی تمام نثری جہتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد جو نقطہ نظر سامنے آتا ہے وہ فکری اور معنوی سطح پر شعور کی اس داخلی کیفیت کا غماز ہے جو پاکستانیت کے حوالے سے مستقبلیات کی خوش تمنائی کا اظہاریہ بن جاتی ہے۔ موضوعاتی کینوس پر تجسس کا سفر معروضیت کے اس تخلیقی تجربے کا ایسا رابطہ ہے جس پر بالیدگئ فکر کی لہریں نئے موسموں کے ارتعاش کا زندہ استعارہ ہیں۔

حواشی:۔

۱۔ مشفق خواجہ، مقدمہ حرفے چند، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۲، ۲۰
۲۔ ایم حبیب خان، جمیل الدین عالی۔ فن اور شخصیت، دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۳۲۳
۳۔ نئی قدریں، حیدر آباد (پاکستان) شاعر نمبر، شمارہ ۴، ۱۹٦۷ء، ص ۳٦۵
۴۔ مشفق خواجہ، مقدمہ حرفے چند، ص ۱۴۔ ۱۵
۵۔ شبیر علی کاظمی، جمیل الدین عالی..... فن اور شخصیت، مرتبہ ایم حبیب خان، ص ٦٦
٦۔ مشفق خواجہ، مقدمہ، حرفے چند، ص ۱۴

ضمیمہ

"نقار خانے میں" ۱۹۸۱ء تا ۱۹۹۱ء کے اظہاریوں کا اشاریہ

۱۹۸۱ء

۲۔ جنوری ۱۹۸۱ء
دو بقراطوں کے اقوال + ذرائع اور امکانات کا احوال (برگد اور منافع بخش درخت، بدحالی اور امکانات)

۹۔ جنوری ۱۹۸۱ء
ابن انشاء بے بدل + کیا قول کیا عمل (کبھی خود پاکستان ایک نامعلوم امکان تھا، پاکستان کی پلوٹونیم)

۱۶۔ جنوری ۱۹۸۱ء
کچھ تنقیدی مجبوریوں پر + کچھ شعلے، شبنم، پتھر ("تخلیقی ادب" ایک نادر مجموعہ تخلیقات ہے، مثالیں)

۲۰۔ فروری ۱۹۸۱ء
بیماری، چہرہ، شفا + وہ کتابیں کہاں ہیں (خزاں میرا موسم بہارستان نو ہے، ایک منظر، اب شروع کرو، سر بہ کف، ان کی کتابیں کہاں ہیں، خزاں میرا موسم)

۲۷۔ فروری ۱۹۸۱ء
بھولے سوالات + فیض ستر کے ہوئے (دو مسلمان کیوں لڑ رہے ہیں، دجلہ تا رکنا باد)

۶۔ مارچ ۱۹۸۱

برف کا پگھلنا + برف کا جمے رہنا (ہمیں جیسے دور کی بھی سوچ سکتے ہیں' کیا پاکستان بے مستقبل ہے' اہل فکر کی پوزیشن)

۲۰- مارچ ۱۹۸۱ء

ابن خلدون' ٹائن بی اور حالات + عصبیت اور چیلنج کے مسائل (لوگو اہل فکر کو تلاش کرو اور ان کی سنو' عصبیت کا مسئلہ' چیلنج کا چیلنج)

۲۷- مارچ ۱۹۸۱ء

اہل فکر کیسے تلاش ہوں + مذہب کی روشنی میں تفکر (انڈکسوں میں "مضامین قرآن حکیم" ایک بیش قیمت اضافہ ہے' ڈاکٹر آغا افتخار حسین کی کتاب)

۳- اپریل ۱۹۸۱

علم و فکر کی دسترس + اس سے ڈھائی ہزار برس (پھر "تخلیقی ادب")

۱۰- اپریل ۱۹۸۱ء

مسٹر جسٹس عبدالسلام فاروقی + مہارت' وضع اصول پرستی (ادبی معاشرہ کیوں سکڑ رہا ہے؟ ادبی معاشرہ بحران میں)

۱۷- اپریل ۱۹۸۱ء

روپے' تربیت' بیزاری + چھتیس روپے اور عام قاری (سالنامہ "فنون" بہت کچھ لے کر آیا ہے' "قومی ادب")

۲۴- اپریل ۱۹۸۱ء

ایک خط کئی سبب + وہ لڑکی اور ادب (پھر ہم انہیں بتانے والے کون' وہ لڑکی اور ادب)

یکم مئی ۱۹۸۱ء

بے اثری اور عرض وفا + اب اک خط اک لڑکی کا (اب دوسرا خط' لب پہ آ سکتا نہیں' بحران اور ہذیان)

۸- مئی ۱۹۸۱ء

کچھ رومن اقدار و آثار' ایک اور کارنامہ "افکار" (فائدہ' اس زبان میں کچھ ہے؟ کارنامہ "افکار" پروفیسر ممتاز حسین اور لاعلمی)

۱۵- مئی ۱۹۸۱ء

اصلیت اور تہذیب کا عالم (مولانا حسرت موہانی اور ہم، شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا)

۳۰- مئی ۱۹۸۱ء

کنویں، دریا، سمندر + جھریوں کا لشکر (اسے ایسا آسان سمجھ رکھا ہے، فیصلے ان کے ہوں گے)

۵- جون ۱۹۸۱ء

کلیات اور مناظر + کچھ باطن، کچھ ظاہر (پتلیاں جو بے بس ہیں، ایوبیہ، بجلی اور سہولتیں)

۱۲- جون ۱۹۸۱ء

ٹیکنالوجی اور مزاج + مستقبلیات چھوڑیے ("بستی" اور "کاروان وجود" بڑے ادب پارے ہیں، مستقبلیات سوری، ہماری خاص خوش قسمتی)

۱۹- جون ۱۹۸۱ء

ایک ضابطہ خطوط + ذہنی صدمہ اور رویے (رکھ تسلی کہ یوں مقدر تھا، وہ صدمہ، بنیادی رویے کا مسئلہ)

۲۶- جون ۱۹۸۱ء

کویت کا مشاعرہ + پاکستانیت کا مظاہرہ (پرانے زمانے یاد آگئے)

۳- جولائی ۱۹۸۱ء

شکریہ، معذرت، انتخاب الشعراء (خلیج میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی محفلیں، مرد جنون، مرد لیلیٰ، مگر ------ جہاں اور بھی ہیں)

۱۰- جولائی ۱۹۸۱ء

مقبولیت، عقوبت، ایمان، رمضان، گرانی (اور مسلمان، ادب میں بے ادبی، عقوبت اور تسلسل مظالم، ادبی اسکینڈل سازی، کچھ غلطیاں)

۱۷- جولائی ۱۹۸۱ء

اظہار کے محدود راستے + عام فکری مغالطے (وہ کیا لکھتے ہیں "ہم" کیا لکھتے ہیں، بورڈم معاف مگر، ایک ادبی قضیے کا اختتام)

۲۴- جولائی ۱۹۸۱ء

فکر، ذکر اور جینا + کون بینا کون نابینا (کہ او کم می شنید از نازو من بسیار می گفتم، کام کی بات اور آنکھیں، اے نازک طبع لوگو۔۔۔۔۔۔)

۲۷۔ جولائی ۱۹۸۱ء

بہانے اور حوالے + عظمت اور ابر (بڑا آدمی لازماً منکسر المزاج ہوتا ہے، عظیم وابدی، صرف دو لمحے)

۳۱۔ جولائی ۱۹۸۱

سفر یورپ اردو حوالے + یہ "چھوٹے" لکھنے والے (فارغ است از مدح و تعریف آفتاب، وہ جھنگ والا)

۱۶۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء

مغرب میں اردو مشاعرے + افراد، واقعے، فاصلے (آتش فشاں خوابوں کی خاموش نیند، سفر در سفر در سفر)

۲۳۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء

کچھ معافی، تلافی + کچھ گفتگو اضافی (مگر کمال مشرق کا کیا انتظام ہے، سفرنامہ، وہ عجیب پاکستانی، ایک سوال)

۳۰۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء

میری احسان فراموشی + ممتاز حسن مرحوم (کسی جگہ سے پرندوں کا کوچ کر جانا، وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے، ایک خوفناک نتیجہ، کمینہ پن اور احتجاج)

۴۔ نومبر ۱۹۸۱ء

میری احسان فراموشی + ممتاز حسن مرحوم (کسی جگہ سے پرندوں کا کوچ کر جانا، وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے)

۶۔ نومبر ۱۹۸۱ء

اس مڈل کلاس کا المیہ + انجینئرنگ اور اردو (کاش وہ دورہ ایک دور بن جائے، شہادت، ایک غیر ادبی کارنامہ)

۱۳۔ نومبر ۱۹۸۱ء

سید شمس الحسن مرحوم (بڑی تاریخ، بڑی شخصیت، ظاہرش مرگ و باطن

زندگی)

۱۹۔ نومبر ۱۹۸۱ء

سید شمس الحسن مرحوم (بڑی تاریخ، بڑی شخصیت، ظاہرش مرگ و باطن زندگی)

۲۰۔ نومبر ۱۹۸۱ء

لکھنے والوں سے مطالبات + علامہ اقبال کی مشکلات ("ملت" کا ادبی ایڈیشن ایک خاص "دستاویز" ہے، علامہ اقبال کی کش مکش)

۲۷۔ نومبر ۱۹۸۱ء

ڈینس للی اور قومی گرانٹ (ہم آپ اور اہل برائٹ، علم اور ایک اعشاریہ پانچ صد، ڈیورانٹ کون؟ علم کے حکم پر عمل؟)

۴۔ دسمبر ۱۹۸۱ء

کچھ خبر کچھ فکر کا حال احوال (ایک پاور "فنون" ایک "نیرنگ خیال" پیڑ اور آدمی، صحرا میں کہاں ملتا ہے، ایک پاور "فنون" ایک اور پاور "نیرنگ خیال" مقدار اور معیار)

۱۱۔ دسمبر ۱۹۸۱ء

تار، کتار اور سر + باتیں اور منظر (باہمہ در گفتگو بے ہمہ باماجرا، تند، کتار و کندھ "زیر پیالہ" "ماجرا")

۲۵۔ دسمبر ۱۹۸۱ء

وہ سر اور وہ فیض دوام + شاہ لطیف کا نام اور کام (سندھ کی مٹی جہاں بھی پہنچے لوگ اسے لیں چوم، اثر، نظر، خبر)

۱۹۸۲ء

۴۔ جنوری ۱۹۸۲ء

وہ سر اور فیض دوام + شاہ لطیف" کا نام اور کام (سندھ کی مٹی جہاں بھی پہنچے لوگ اسے لیں چوم، اثر، نظر، خبر)

۵۔ اپریل ۱۹۸۲ء

نقل اور طبعزادیت + تاریخ اور انفرادیت (ورق نے کھول کے رکھ دیا کہ بسم

اللہ' حضرت شاہ مدار' شب راغب' ریٹائرڈ وفاقی ملازمین' خدمت خلق)

۱۸۔ اپریل ۱۹۸۲ء

بے تعصبی' محبت' صداقت + محنت' لیاقت' عظمت (پیر حسام الدین راشدی زندہ رہیں گے)

۱۲۔ مئی ۱۹۸۲ء

کیسی خبریں' کیا افکار + بادہ' ظرف' قدح خوار (کون فضل الرحمٰن خان؟)

۱۶۔ مئی ۱۹۸۲ء

ذاتی مسائل اور خلق خدا + کچھ ذکر ۴۸ کروڑ بھوکوں کا (رکاوٹیں خود نہیں ہٹا کرتیں' حرف ایک تقابلی مطالعہ' کس سے منصفی چاہیں؟)

۲۷۔ مئی ۱۹۸۲ء

پروفیسر عسکری مرحوم کا بیان + حادثہ جو متواتر ہے (اتنا بڑا ملک تو آدھا کر دیا' انہماک حادثے کا تواتر)

۳۔ جون ۱۹۸۲ء

کچھ بقول آغا شاہی + قول' بیانات اصلاحی (علم پر طاقت کیوں حاوی رہی ہے' قول ہربرٹ ایلس' پیر راشدی صاحب کے مضمون' وہ آدمی کب آئے گا' پاور اور علم کا مسئلہ)

۶۔ جولائی ۱۹۸۲ء

کتنی خرابی + یہودی لابی (اور طبیعت ادھر نہیں آتی' یہودی لابی اور عرب دولت' مستقبل قریب اور جنگی اطلاعات)

۲۰۔ اگست ۱۹۸۲ء

بے وقت جانے والے + قومی نغمے بنانے والے (مثبت ثقافتی تسلسل فکری لازمہ ہے' سب بے وقت گئے' یوم آزادی اور ظواہر' دو ہزار قومی نغمے اور مقابلہ)

یکم۔ ستمبر ۱۹۸۲ء

فلسطین کی امر کہانی + حق باقی فسطائیت فانی (سقراط سے اب تک' فسطائیت ضرور ہارے گی' اگلے چند برس)

۹- ستمبر ۱۹۸۲ء

اچھائی اور برائی حکایت (بنگلہ دیشی اردو والوں کی شکایت 'اختر حسین صاحب بڑے آدمی ہیں)

۱۹۸۳ء

۱۸- فروری ۱۹۸۳ء

تطبیعت اور ترجیحات فکر و اظہار + کچھ مادی اعداد و شمار (آؤ لوگو! ضلع مانسہرہ کی سیر کریں)

۹- مارچ ۱۹۸۳ء

ایک دور تقلید + ایک عظیم تمہید (ہائے یہ اعتراف' سچائی سے واپسی کا جبر'اصل اعتراف نامہ)

۱۵- مارچ ۱۹۸۳ء

میں' دریا' شہر' آگ + قول اور فکر کے ناگ (ڈیڈی' چوزے اور میمنے کھیلتے کیوں ہیں؟ مقولے' پرانا' زندہ مکالمہ)

۳۰- مارچ ۱۹۸۳ء

اذیت' اقلیت' این و آن + شاعر' قومیں' سیاست دان' (پوری زندگی' نامکمل علم انسانی' شاعر' قومیں' سیاستدان' اقلیت اور اکثریت کے کردار' اذیت ایک تحفہ)

۱۳- اپریل ۱۹۸۳ء

علم میں انتخاب' عمل میں کامیاب (محبوب سندھ' رفیق ایران' فرزند پاکستان پیر حسام الدین راشدی' آتش وفا' ناممکن القیاس کام)

۲- جون ۱۹۸۳ء

ٹینسی ولیمز اور لفظوں کا محاصرہ' وائی کنگ اور رومن معاشرہ (کیا وقت نے صرف لباس بدل دیئے ہیں' یہ رومن معاشرے کی جھلکیاں' اس ڈنمارک کی خواتین)

۱۸- جون ۱۹۸۳ء

خواتین مجالس قانون ساز' ہر گھر میں خاتون کارکن' قانونی کاروائیوں میں

بھرپور حصہ لیا جائے (ہر گھر میں کارکن، قانونی کاروائیاں)

۱۲۔ جولائی ۱۹۸۳ء

ایمان، ریفلیکشن پیغام + عالم اسلام اور اسلام (ہائے وہ ہم جو ان کرنوں سے آگ لگائے جاتے ہیں، جھوٹا کون ہے؟ ایمان اور ریفلیکشن ایکشن)

۱۹۸۴ء

۱۷۔ جنوری ۱۹۸۴ء

جذباتی سوچ اور صریر خامہ، کچھ خاکہ کچھ منظر نامہ (چوبِ خشک سے آواز دوست، چند حقائق)

۲۳۔ جنوری ۱۹۸۴ء

حالاتِ حاضرہ اور فریاد + ملتان، لاہور، اسلام آباد (صوبائیت اور بین الاقوامیت میں پاکستان دھندلا نہ جائے)

۳۔ فروری ۱۹۸۴ء

پاکستانِ فکر و طلب + "معاصر" اور "تخلیقی ادب" (یعنی اگر پڑھو اور سنو اور جانو، "تخلیقی ادب" کراچی)

۱۱۔ فروری ۱۹۸۴ء

ایک سلور جوبلی جو منائی نہیں گئی + وہ عظیم مقصد اور ادارہ زندہ ہے ("معاصر" لاہور سے ایک معذرت)

۲۴۔ فروری ۱۹۸۴ء

کیا تقدیر بے تدبیر + ہر شروعات میں تاخیر (اب حیرتوں پر حیرتوں کا زمانہ نہیں، وہ جاپانی کہانی، بیش بینی کا فضول مکتب فکر، بوئے رفاقت)

۴۔ مارچ ۱۹۸۴ء

ماہرین کی کہانی + سچے بانی، بڑی قربانی (یہ دریا بہتا جائے گا، شاہ، ملکہ، ماہرین اور کولمبس، بندوق اور تیر، دس میل فی گھنٹہ ناممکن، مزید ناممکنات، نئے ماہرین اور پاکستان)

۱۶۔ مارچ ۱۹۸۴ء

چار صدیوں کی پہچان + پاکستان یا وفا قستان (اے خاصۂ خاصان رسلؐ وقت

دعا ہے' اجتماعی دانش؟ محض وفا قستان یا پاکستان)

۳۰- مارچ ۱۹۸۴ء

ناممکن امکانات + بدلتے ہوئے حالات (پاکستان میں اجتماعی دانش کا مسئلہ' نئی یوٹوپیا)

۱۴- اپریل ۱۹۸۴ء

سفر ہندوستان + مذاکرہ ادیب پاکستان (من بھاشا کو آخر کس دن سمجھے گا انسان' لاعلمی' خلاصۂ مذاکرہ لکھنؤ وانبالہ' لمحۂ حیرت)

۲۵- اپریل ۱۹۸۴ء

چند قومی رجحانات + قارئین و سامعین سے سوالات (اس سروے میں مدد فرمایئے' سروے)

۳- مئی ۱۹۸۴ء

اسٹے ٹس کی نئی علامات + ادبی آمدنی' غربت' تاثرات (ابھی ایشین ڈرامہ ہی چل رہا ہے' مقبول اردو شعراء کی آمدنی' غزل اور قوالی' معاشی تاثر' ایشین ڈرامہ)

۱۱- مئی ۱۹۸۴ء

سانحہ نواب پور' سوالات: کچھ وجوہ کچھ خیالات (دوغلا معاشرہ' ہاں یا نہیں' عام شاونیت)

۳۱- مئی ۱۹۸۴ء

سخن زبان' سخن دل + ایک عجیب محفل (بقول سعدیؒ' سخن ہائے گفتنی' ایک عجیب محفل)

۱۰- جون ۱۹۸۴ء

دو بوڑھے بیمار + ذاتی سروے کی بہار (اے بے تمیز' گنج کو ویرانہ چاہیے' اور حکومت پاکستان' بوگس باتیں' سروے کے نتائج)

۱۸- جون ۱۹۸۴ء

خرد افروزی کی روشنائی + چالو باتیں اور اپنی سچائی (ڈاکٹر آغا افتخار حسین قزلباش انتقال کر گئے' روشن خیالی کے علمبردار' یورپ کے پس منظر میں' چالو

باتیں اور اپنی سچائی)

۲۵- جون ۱۹۸۴ء

وہی معیار جلال و جمال + داغ، کروچے، اقبال (برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست، وہی معیار و قرار، کروچے)

۵- جولائی ۱۹۸۴ء

یہ زمینِ خوش نہاد + ایک مثل اور تضاد (صدر ماؤ، غالب اور جان ڈن، ایک مثل اور تضاد، ہزار میں تین سو روپے، مالکان اقلیم ادب، بڑے منہ بڑی باتیں)

۲۷- جولائی ۱۹۸۴ء

سرمایہ اور اہلیت + پانچ مثالیں (عام خوش حالی کیسے آتی ہے؟ صرف چند مثالیں کیا درکار ہے؟)

۶- اگست ۱۹۸۴ء

سائنس، ٹیکنالوجی، تہیہ، دفاع اور معیشت (مستقبل، عزم و عقیدہ اور شاخیں، ہمارے صاحب اہلیت ماہرین، ایک مثال------ بینکنگ، ٹیکنالوجی، عام اہلیت اور مثالیں، اہلیت کیسے آئے؟ عوامی اور سرکاری شرکت)

۱۳- اگست ۱۹۸۴ء

قومی مذہب: اسلام (قومی مسلک: سائنس اور ٹیکنالوجی، تقابل، تساہل، عزائم------ ماضی قریب، حال، کرشمے، پھر بھی غم ناک صورت حال، نئے عزائم کی تصویر)

۲۰- اگست ۱۹۸۴ء

فرمایا اقبالؒ نے + اردو، نتائج، انکسار (ہنریک سکولی موفسکی اور نظریہ احسان، فرمایا علامہ اقبالؒ نے، نفاذِ اردو------ ایک مثال، ہنریک سکولی موفسکی)

۲- ستمبر ۱۹۸۴ء

یاد، فراموشی، بے گھری + ۱۹۴۸ء اور ۱۹۸۴ء (سلیم احمد کی پہلی برسی، یادیں،

محبت اور فراموشی)

۱۱- ستمبر ۱۹۸۴ء

قربانی اور مظاہرہ' آزادی اظہار اور معاشرہ (چیست اندر خم کہ اندر نہر نیست' قربانی کیوں؟)

۳۰- ستمبر ۱۹۸۴ء

ناغہ' سفر' علم و زبان (تین سو روپے اور صبا کا خاندان' اب ادیب برادری اور معاشرہ کیا کہتے ہیں؟ بڑے مسائل اور تین سو روپے' سبط علی صبا کا خاندان)

۱۳- اکتوبر ۱۹۸۴ء

دو غلطیوں کا اقدار------ صبا ٹرسٹ پراسرار (اے سورج ابھر اور ان بادلوں کو فنا کر دے' مالیات صبا مرحوم' پراسرار خاموشی' گہرے بادل اور روشنی)

۱۷- اکتوبر ۱۹۸۴ء

بے کاری' بیماری کا ماتم------ غرباء و امرائے عالم (عالمی بینک کی ترقیاتی رپورٹ ۱۹۸۴ء' حل' ادب' سیاست' رویے؟ ایک بہت اہم دستاویز' چونتیس غرباء)

۲۷- اکتوبر ۱۹۸۴ء

قومی ترجیحات------ کرکٹ کے عجائبات (معیشت پر خلاصہ در خلاصہ' عالمی ترقیاتی رپورٹ ۱۹۸۳ء)

۶- نومبر ۱۹۸۴ء

انجمن تنہائی------ انجمن خراچان (مستقبل کی پہلی ذمہ داری ہماری ہے' انجمن تنہائی' انجمن خراچان' باقی ماندہ تاثرات)

۱۳- نومبر ۱۹۸۴ء

الفاظ کی بے جانی------ دو سوال سو کہانی (گندم سے گندم' جو سے جو' ۔۔ بے جانی الفاظ)

۲۶- نومبر ۱۹۸۴ء

وہی بے لطفی اظہار ------ پھر اعداد و شمار (پاکستان سنہ دو ہزار دس میں؟ وہی رونا دھونا' پھر اعداد و شمار' تین احساس)

۲- دسمبر ۱۹۸۴ء

تبدیلی اور عروج و زوال' کچھ لسپکال باقی بزبان اقبال (کاش ان گزارشات پر غور ہی کیا جاتا' تبدیلی' دانستہ' نا دانستہ پشیمانیاں اور پریشانیاں' حالت بدلو)

۸- دسمبر ۱۹۸۴ء

ہاتھی اور گھاس' آس ہی آس ہی آس (استحصال ------ لا مذہب اور بے علاقہ ہے' مہلک بیگانگی)

۱۹۸۵ء

۷- جنوری ۱۹۸۵ء

کانفرنسیں' مشاعرے' شہر پیائی (اردو کا پھیلاؤ اور توانائی' برف اور مشاعرے' بنام فیض' پاکستانیت کے مظاہرے)

۱۶- جنوری ۱۹۸۵ء

ایڈ مٹن کا برناب' کراچی وغیرہ کے سیلاب (اس آخری سانس کی شیشی' ایک مثال ------ ایڈ مٹن کا حال' دیگر احوال)

۲۴- جنوری ۱۹۸۵ء

معمولی واقعات' ذہنی ترجیحات' عجائب گھر اور طلبہ (وہ واقعہ' سوال و جواب)

۲۸- جنوری ۱۹۸۵ء

موازنے' امکانات' ابن انشاء' شکوہ زیر لب (گلڈ کی چھبیس ویں (۲۶) سالگرہ ------ ۳۱- جنوری' ہمارا محبوب ابن انشاء' ایک شکوہ زیر لب)

۷- فروری ۱۹۸۵ء

غلطی ہائے انشاء و املا کا ورود (غیر پروفیسر برادرم طاہر مسعود' غالب' فروری اور ہم' صورت گری)

۱۴- فروری ۱۹۸۵ء

کلغی اور تحقیق ------ رضاکار شبیر علی کاظمی (آتش بنہادم شور آب از

سر تف مغزم' تباہی' گمنامی' موت)

۱۹- فروری ۱۹۸۵ء

ایک پرانی کہانی' مائیلو' فیثا غورث' چونی (آتش بنہادم شور آب از تف مغزم' مائیلو اور فیثا غورث' تف' سر' مغز' اتنا زور کیوں؟)

۲۶- فروری ۱۹۸۵ء

مصنف' ناشر' کتب فروش' قاری (یہ چار عناصر ہوں تو چلتی ہیں کتابیں' مسائل' سفارشات اور وقت' کانفرنس' کمیٹیاں' تعاقب' اعلانات اور مضمرات)

۱۲- مارچ ۱۹۸۵ء

فیصلوں کی ضرورت اور معلومات' ایڈ۔سن کی علمی کرامات (ماہنامہ "طالب علم" ایک حیرت انگیز سلسلہ ہے' ایڈ۔سن کا واقعہ)

۱۹- مارچ ۱۹۸۵ء

تجزیوں کے سائل علم' اصل و سائل (کچھ حال و مستقبل میں ہی کر دکھاؤ' اور وہ لفظ ہے اقراء' طبقاتی تجزیوں کی مشکلات' علاج بذریعہ علم)

۲۶- مارچ ۱۹۸۵ء

غلطی اور تصرف' مردانہ ڈویژن کیوں نہیں (شکوہ در باب خواتین' عورت کی دشمن عورت' اسلام' عورت اور نعرے' و۔مینز ڈویژن' مینز ڈویژن)

۲- اپریل ۱۹۸۵ء

دہلی میں ۲۳۔مارچ' مشاہدے' یادیں اور عزائم (کچھ مشاہدے' کچھ یادیں)

۹- اپریل ۱۹۸۵ء

وہ آفات ------ وہی مستقبلیات (کچھ دہلی کے حالات' تازہ آلام اور پیش بینی' اصل مسئلہ' رویہ' مشاعرہ' مذاکرہ)

۱۶- اپریل ۱۹۸۵ء

لوک ورثے کا میلہ اسلام آباد (نیا ورثہ' اپیل' فریاد' دہلی' ٹی وی والے' نیا ورثہ ------ دو چہرگی' کچھ مشاہدات' دھلی' قرۃ العین حیدر' انتظار حسین)

۷- مئی ۱۹۸۵ء

بے مضمونی، بوقلمونی، آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں (ایک پرانا گیت)

۱۴- مئی ۱۹۸۵ء

یک جہتی، گریڈ آباد، رشید امجد، منشا یاد (ہم نے یہی پایا کہ برا نام نہ پایا، گریڈ آباد کی جھلکیاں)

۲۴- مئی ۱۹۸۵ء

عالمی اردو کانفرنس پاکستان میں (اپنی پیاس------ شرکت احساس، ایک چولستان بھی ہے، مزید بورڈم، عالمی اردو کانفرنس)

۲۸- مئی ۱۹۸۵ء

بلوچستان------ افسانے، مناظر اور خزانے (غلطی ہائے تلفظ مت پوچھ، رسید خطوط و غلطی ہا)

۴- جون ۱۹۸۵ء

علاقائی یا قومی سراپا------ تاریخ کی آپا (ہاں ہاں وھوں ھوں)

۱۱- جون ۱۹۸۵ء

کراچی، آفات اور مینجمنٹ، کوئٹہ، جیسے، بداعمالیاں (پو مپے کی فلمیں ہی دکھا دیجیے، بستے بستے بستی ہے، مگر مینیجری، جیسے کی کہانی، یاد، خوف اور وارننگ، حکومت کو مشورہ)

۱۸- جون ۱۹۸۵ء

ملی جلی باتیں، معنوی گھاتیں (ہم دلی از ہم زبانی بہتر است، پانی------ اختر حسین مرحوم کی زبانی، زمین، ملک، صوبے)

۲- جولائی ۱۹۸۵ء

ٹریفک میں موت کے محاذ، قوانین بے ترجیح و بے نفاذ (وہ اور ہم، ترجیح کیا ہے؟)

۹- جولائی ۱۹۸۵ء

وضاحت------ وی آئی پی------ علم------ جی آئی پی (کون ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی، وی آئی پی اور جی آئی پی)

۲۳- جولائی ۱۹۸۵ء

شکریہ، معذرت، مکاتیب، "پاکستان ناگزیر تھا" (عمر تک مشق تمنا کرنا، پاکستان ناگزیر تھا)

۳۰- جولائی ۱۹۸۵ء

پانچ فیصد اقراء سرچارج، اے پی این ایس کا احتجاج (مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے، تعاون، رحم، کار خیر، ایک کارکن ------ ممتاز حسن، بر سر مطلب)

۶- اگست ۱۹۸۵ء

حالات، امکانات (وہ ہمیشہ تم سے وابستہ رہتی ہے، امید)

۱۳- اگست ۱۹۸۵ء

منظر نامہ، کراہ نامہ (اے چودہ اگست جواب دے، دوسرا رخ، اتنا بڑا ملک)

۲۰- اگست ۱۹۸۵ء

مادام الوا اور درندے، ریکارڈوں کے خاموش پرندے (مگر ہبا کو شابو لے جائیں گے، مادام الوا مرڈال، مکالمہ، جشن، کوئٹہ، ایک دلچسپ ریکارڈ)

۲۷- اگست ۱۹۸۵ء

شاہ لطیف سے برکت پائیں، علن اور عالی کی دعائیں (آنکھوں کا عطیہ، علن فقیر اور تین سو)

۳- ستمبر ۱۹۸۵ء

پھر علن فقیر، شاونیت کے اسیر ------ تین ترجمانی مہمات (خوف، فساد خلق، تین ترجمانی مہمات، اصلاحات ریاضی، کسٹم ایکٹ ۱۹۶۹ء، علمی سائنس)

۱۷- ستمبر ۱۹۸۵ء

پھر یاجوج ماجوج نمودار، پھر تعمیر دیوار (دھوئیں بھرے ہیں، دلوں میں دماغ جلتے ہیں، یاجوج ماجوج)

۲۴- ستمبر ۱۹۸۵ء

کئی عنوان ------ ایک اعلان (یہ دھرتی مری ماں ہے اس کی عزت مجھ

کو پیاری ہے'، غیر پیشہ ور اہلِ قلم'، مشتاق یوسفی'، مسائل ہی مسائل'، عظمیٰ تا صغریٰ'، سترھویں صدی'، اٹھارویں صدی'، انیسویں صدی'، بیسویں صدی'، ثبات اک تغیر کو ہے'، مارکس اور لے لیس'، لینن)

۸۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء

وہی نا اتفاقی'، وہی جارحیت'، طاقت اور قانون فطرت (ابھی فرنگ سراسر مرے وجود میں ہے'، طاقت اور قانون)

۱۵۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء

خبر'، ادب'، اثر------ اقبال تا سارتر (کوئی صوبہ استحصالی نہیں ہوتا'، علامہ تا سارتر'، آج کا پاکستان'، آج کی پیشکش)

۲۲۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء

اصناف ادب کے اشاریے'، کالم نہیں اظہاریے (ممتاز حسن مرحوم'، اظہاریے'، پاکستان اور جیوے پاکستان)

۱۹۸۶ء

۱۹۔ جنوری ۱۹۸۶ء

برفانی مشاعرے'، مرگ مسلسل'، پاکستانی سخت کوشی (اس بار ہندوستانی وفد علم کا تحفہ لایا تھا'، اوسلو کا مشاعرہ'، سخت کوشی'، حب الوطنی'، مرگ مسلسل'، پاک بھارت نئے تعلقات'

۲۷۔ جنوری ۱۹۸۶ء

چھوٹی قوم کی بڑی کہانی'، ناشتہ'، جوتوں کے تسمے'، نقل مکانی (جمہوریت'، روشن خیالی'، محنت'، کہتر مگر بہتر'، ناشتہ'، جوتوں کے تسمے اور خلاصہ'، برف میں گرم سڑک'، جادہ اور رہ)

۳۔ فروری ۱۹۸۶ء

نام'، تلفظ'، حسن زبان------ سٹی ہال'، فار قلیس اور شاہجہانی (پاکستان میں پاکستانی'، شہر'، نام'، تلفظات'، کچھ سٹی ہال پر'، مضبوط'، شاندار فن پارہ)

۱۰۔ فروری ۱۹۸۶ء

یہ اظہاریہ------ یہ بے قراریہ (آنجہانی الوامرڈال کے لئے'، ان کے

عیوب، چند اوصاف؟ بے اثری، بااثری، تابعداربیوی)

۱۷- فروری ۱۹۸۶ء

فلاحی ریاست + سوچ اور جرأت ("واقعی "مظلوم اقبال"" فلاحی ریاست کیا؟ مساوات، ضعیفی اور موت)

۲۴- فروری ۱۹۸۶ء

دبئی کے شائقین ادب------ فیض کے نام وہ شب ("دستاویز"------ ایک خوش خبری، شب فیض، سامعین کو سلام)

۳- مارچ ۱۹۸۶ء

پاکستان بلوچستان + ایک خوش گو نوجوان (انہی کے دم سے ہے، کچھ اعتبار خوابوں کا، میرا بلوچستان، میلہ، مشاعرہ)

۱۰- مارچ ۱۹۸۶ء

تحریک درخانی کی یاد------ ان دیکھے آثار (مدائن صالح)

۱۷- مارچ ۱۹۸۶ء

خاموشی اور انتظار------ ایک مشاعرے کا سانحہ (منتظمین، سامعین اور شعراء کی بے حسی، ایک سانحہ، لمحۂ فکریہ)

۲۵- مارچ ۱۹۸۶ء

اظہار کی راہیں------ گرم گرم نگاہیں (تو پھر ادیب کیا کریں؟)

۳۱- مارچ ۱۹۸۶ء

ایک وفاق کی کہانی + ہملٹن اور لنکن کی زبانی (ڈاکٹر فواد عمران خان، عجیب اور اچھی مثالیں)

۷- اپریل ۱۹۸۶ء

کچھ بدیہات زیر غور------ اب ایک اور دور (پاکستان اور اس سے بڑھ کر کوئی مری پہچان نہیں، زندگی، بہتر زندگی، افق در افق)

۱۴- اپریل ۱۹۸۶ء

ایک قول، ایک سوال------ کچھ پھر صاحب کا حال، نفاذ اردو کی سمت میں، اصل سوال، جاسوسیات، ہمارے پیر صاحب، (دو جامعات سے اپیل)

۲۱- اپریل ۱۹۸۶ء

تقاریب، خطوط اور معذرت (تصانیف و مصروفیات راشدی، کانٹے جلے اور میرے پاؤں جلا دیئے، جوابی حملہ)

۲۸- اپریل ۱۹۸۶ء

کتابت بے اضافت------ پنبہ بگوشی، سرمہ در گلوئی (چند کلمات توصیف------ سید سبط حسن کے لئے، پنبہ بہ گوشی، سرمہ در گلو)

۵- مئی ۱۹۸۶ء

خوش خبر، بے اثر------ جشن گندم ("مقالات حسرت" ایک تاریخی اضافہ ہے، جشن گندم، ایک کتاب لاجواب)

۱۲- مئی ۱۹۸۶ء

بلما جاجا، پاکستان، پاکستان، بڑے آدمی کی پہچان (اردو میں سائنس کی تدریس کامیاب ہے، مولانا ایدھی، کچھ خوابیں، کچھ تعبیریں، بابائے اردو کا منصوبہ)

۱۳- جون ۱۹۸۶ء

معاشی تعطل اور گرانی، برطانیہ میں پاکستانی (بی-بی-سی- آئی ایک درخشاں کتاب ہے، مہنگائی اور ٹھہراؤ)

۱۶- جون ۱۹۸۶ء

ایک بڑا خادم------ ایک بڑا انسان (ایک نابغہ فرزند پاکستان------ جمیل نشتر مرحوم، ان کے احسانات، خاص تصورات، بن جتائے احسان)

۲۳- جون ۱۹۸۶ء

خود کلامی، ترجیحات ٹی وی، خلیل جبران، آغا حسن عابدی، ابن حسن برنی، (تم ہاتھ روکے حاجت مند ڈھونڈتے ہو، ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں، بخشش ((Giving)

۷- جولائی ۱۹۸۶ء

لخ لومند کا پاکستانی ہوٹل، یہ بے توقیر اور اخلاق مشاہیر، تمہارے پاکستان میں بڑے امکانات ہیں (اخلاق مشاہیر اور ڈاکٹر مرڈال)

۱۴- جولائی ۱۹۸۶ء

سفر اور مقامیات------ ہم اور جواب آں خرافات ("نیکی فطرت انسان کا کمال ہے" محمد طفیل مرحوم' کش مکش اور استقلال کا نمونہ' بقراطی' تذلیل پاکستان اور ہم)

۲۱- جولائی ۱۹۸۶ء

ایک خادم تعلیم انسان ------ حسن علی عبدالرحمٰن (وقت اور کرہ ارض' وہ خادم تعلیم' چند واقعات' وقت)

۲۷- جولائی ۱۹۸۶ء

بیروزگاری ------ قومی فضا' کیا مسائل کیا گفتگو

۴- اگست ۱۹۸۶ء

شہاب مرحوم' عجز بیان' کچھ معیشت کی داستان' عام آدمی کی لابی' (مباحثہ پچھلے کالم سے' تو مطالبہ کیجئے)

۱۱- اگست ۱۹۸۶ء

شہاب صاحب کی چند جھلکیاں' ایسی پرچھائیاں ممکن ہیں (عجوبہ' مثال' معتبر شخصیت' مذہبیات' افسری' ادب اور ادیب پروری' پاکستانیت)

۱۷- اگست ۱۹۸۶ء

جو نام وہی پہچان' پاکستان' پاکستان (مسلسل امکان)

یکم- ستمبر ۱۹۸۶ء

واقعات اور بے اثری------ "ان" کے موضوعات (تاریخ خفا نہ ہو جائے' رنج بے اثری' دو مرحومین)

۸- ستمبر ۱۹۸۶ء

سلیم احمد کی برسی اور امید' فرض' ہر فکر کے گوشے' "فنون" اور "طشت مراد" (فرض' اظہار اور مجبوریاں' "فنون" آگیا' طشت مراد)

۱۵- ستمبر ۱۹۸۶ء

"جریدہ پشاور"------ انسائیکلو پیڈیا (کیا اب بھی علم کی طلب موجود ہے؟ سائنس انسائیکلوپیڈیا)

۲۲- ستمبر ۱۹۸۶ء

"سیپ" کی خاص اشاعت، "عملی سائنس" کی اہمیت، (ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے)

۲۴- اکتوبر ۱۹۸۶ء

سرزمین پاکستان ------ شہر در شہر تا ملتان (آج چاند روشن ہے، فاصلے اور تقریبات)

۲- نومبر ۱۹۸۶ء

صدیوں، مہینوں کی کہانی ------ ایک مثالی پاکستانی (ہاں ایسے افراد ممکن ہیں، وہی ممتاز حسن مرحوم، دوسرے علاقے)

۹- نومبر ۱۹۸۶ء

اوری گن کا افق، سبق در سبق (وحشت بے وطنی پیچ و خم قومی نہ پوچھ، اوری گن ٹریل، ہماری اوڈیسی؟)

۱۸- نومبر ۱۹۸۶ء

انسانی درندگی اور علاج ------ وحدت میں کثرت کا امتزاج (معذوروں کے لئے ماہنامہ "آدرش" قول اختر الایمان، مگر آج، وزیر اعظم سے مکالمہ، معذوری اور "آدرش")

۲۴- نومبر ۱۹۸۶ء

درندگی یا شیطنت ------ اللہ سے امید کرم (مولانا الطاف علی بریلوی کی خدمات، کون قیصر الاسلام؟)

یکم- دسمبر ۱۹۸۶ء

قصیدہ گوئی اور اعتراضات، سکندر اعظم اور پاکستان (ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں، اعتراض پر قصیدہ گوئی، تازہ مثال اور سبق)

۸- دسمبر ۱۹۸۶ء

موجودہ خبریں پرانا واقعہ، لاہور میں وہ شام قاسمیہ (ہم اور پاکستانی زبانوں کے مشاہیر، مادر وطن، اسپارٹا کی فصل، وہ جذب قاسمیہ، دوسری پاکستانی زبانیں)

۱۵- دسمبر ۱۹۸۶ء

نام اور معنی کا احوال------ ایک نکتہ تین مثال (ڈھول تیرے پیروں کی ساجن جانوں پوجا پھول' نکتہ' دوسرا نام' تیسرا نام' نکتے کا دوسرا حصہ)

۲۹- دسمبر ۱۹۸۶ء

حیہات' حیہات------ ماتم اور گزارشات (یہ عظیم المیہ پھر قومی یک جہتی مانگتا ہے' چند گزارشات' امتیاز اور انتقام' ماتم تازہ رکھیے' دوسرے صوبے' بیرون ملک پاکستانی' مافیا بمقابلہ قوم)

۱۹۸۷ء

۵- جنوری ۱۹۸۷ء

۱۹۴۷ء کی شان------ ۱۹۸۷ء کے امکان (الفاظ روح مانگتے ہیں' کلیشے روتے ہیں' یہ سچ ہے' سائی لینس' لفظ و معنی' خیال و سوال)

۱۲- جنوری ۱۹۸۷ء

اب بھی آئیں افوائیں------ وہ معمولی محفل اور اہل دل (از ھر بن موچشمہ خون باز کشادم' وہ معمولی محفل' قرارداد محبت' دعوت اور جواب)

۱۹- جنوری ۱۹۸۷ء

سیاہ سانحے روشن شادیاں------ بہانے' جرائم' تجویز (شہر آبائے شہر کو دے دیا جائے' کیا شہر ایک ہے؟ تراشے ہے بہانے' آبائے شہر اور ایک تجویز)

۲۶- جنوری ۱۹۸۷ء

تنہا ارشمیدس اور کروڑوں محسن اور مجرم نسلیں (یہ مقولے تمہارے لئے ہیں' محسن اور مجرم نسلیں' صرف ایک فقرہ)

۲- فروری ۱۹۸۷ء

تشخیص ہماری------ تجویز تمہاری (اب "قومیتیان کراچی" ایک قومی آزمائش ہے' منتظم منافقت' امید پرستی' بیمار ممالک اور ڈیوانی سی اس)

۹- فروری ۱۹۸۷ء

فکری کراہیں' حیران نگاہیں------ ادا جعفری کا شہر آشوب (نیشنل بنک کی ممتاز اشاعت' اظہار افکار' حیران آنکھیں' ایک شہر آشوب' گلڈ بے

سالگرہ، نیشنل بنک کی ادائیگی، قرض و قرض)

۱۶- فروری ۱۹۸۷ء

زندہ و عظیم صادقین کا اولین نقش دیوار (ابن حسن برنی مرحوم، حیرت کیجئے)

۲۳- فروری ۱۹۸۷ء

معذرت، وضاحت، گزارش------ ثقافتی انقلاب کراچی (غالب خستہ زندہ ہے، گزارش، ثقافتی انقلاب کراچی)

۲- مارچ ۱۹۸۷ء

دوسری خبریں اور تجزیے------ آئینے اور راہ نما (گندم برس رہی ہے، گندم کی برسات، آئینے اور راہ نما)

۹- مارچ ۱۹۸۷ء

ادب میں پاکستانی، ہیجان و رجحان (اکبر ایس احمد کے مزید مطالعے، ڈاکٹر اے کیو خان کی حرمت پر آنچ نہ آنے دو، ایک تفہیم پاکستان، ڈاکٹر اے۔ کیو خان، سازشیں اور گزارش)

۲۳- مارچ ۱۹۸۷ء

بارہ دن آٹھ ملک------ پاکستانی اہلیت، یہاں اور وہاں (نئے سفرائے پاکستان، محنت اور اہلیت)

۳۰- مارچ ۱۹۸۷ء

وا حجاج اور ہمایوں بادشاہ------ آہ، آہ، آہ، آہ! (کرم ایجنسی کے بے گناہ مقتول اور تاریخ، دو روایتیں، خموشی گفتگو ہے)

۶- اپریل ۱۹۸۷ء

وسعت سلطنت عمان------ کچھ وقت صلالہ میں (مزار حضرت ایوبؑ، میدان سامری)

۱۳- اپریل ۱۹۸۷ء

کئی کئی مضامین------ مہمانان و منتظمین (تقریبات مسقط، کمیٹی کو سلام، مسقط اور مہمان نوازی، کریڈٹ بطور مثال)

۲۵- مئی ۱۹۸۷ء

کچھ معذرت' کچھ ژولیدہ کلام ------ دو بڑے خدام عوام (حقیقت' تصور' کنفیوژن' ایک ادائے قرض' ایک دردمند غیر ملکی)

۳- جون ۱۹۸۷ء

حسن عسکری' ڈاکہ اور برادری ------ کراچی اور مسئلہ جبر و قدر (نخلستان ریاض کا حسن انتظام' جبر و قدر اور کراچی' مگر دوسرے سوال' کچھ احوال سفر کا' پاکستانی خواتین و حضرات)

۲۱- جون ۱۹۸۷ء

اسلام آباد اور یادیں ------ صرف ایک جملہ معترضہ (شارٹ کٹ' کے ڈی اے اور وہ شیڈ' اسلام آباد اور دعائیں)

۲۹- جون ۱۹۸۷ء

کراچی کے نئے آلام ------ میاں دم تا بشام (ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے' یہ دستور زبان بندی' پریشانی قلم' میاں دم تا بشام)

۶- جولائی ۱۹۸۷ء

سوات اور سواتی' بچوں کا پیغام ------ جمعہ گل صاحب کو سلام (وسعت پاکستان کا ایک پہلو' انہوں نے کیا کیا' کچھ مناظر کچھ فاصلے' بشام سندھی' وسعت ہی وسعت)

۱۳- جولائی ۱۹۸۷ء

عجیب خبریں' بے حسی ------ جوابات کی سطحیں اور نئی نسل (تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں' معروضی حالات اور فرائض' یہ کیا ہو رہا ہے' چند ممالک و دساتیر' سندھی اور مہاجر فیکٹرز)

۲۷- جولائی ۱۹۸۷ء

بے گناہوں پر جارحانہ یلغار ------ دہشت گردی اور جواز (ماتم' ہمت' مسائل' سوالات' زخم تازہ رہیں گے' وہ مناظر' اصل دشمن کون؟ نتائج اور باتیں)

۳- اگست ۱۹۸۷ء

پھر اسلام ------ صبح اور خبریں (وارث خرد افروزی' صبح اور خبریں'

دوسری خبریں' تین نئی کتابیں' ایک قرض اور ایک فرض)

۱۸- اگست ۱۹۸۷ء

کچھ جائزے عیوبی ------ کچھ ذکرِ حسن و خوبی (دین' زمین' سمندر' دریا' صحرا' کوہستان' نامکمل جائزے' کام کرنے والے' سو یہ کیسے ہو)

۱۴- ستمبر ۱۹۸۷ء

مشکلات تحریر ------ خزانے اور دفینے (مرغ خویش' صد خویش' دام خویش' مسئلہ اور پچیس برس' خزانے اور دفینے' غیر مقتدرہ' مقتدرہ اور دانشور)

۵- اکتوبر ۱۹۸۷ء

غیر حاضری' صدمہ' دعائیں' کچھ حالات اوسلو (ناروے بھی کچھ سبق فراہم کرتا ہے' کچھ اوسلو پر' ناروے ------ ایک پہلو' پاکستانی کا ریکارڈ' قومی ترانہ)

۱۲- اکتوبر ۱۹۸۷ء

جھیل' نقشہ' جائے چندہ' ممالک' لباس' خواتین و حضرات (خبر' تحیر ہندسن' کشتی' جائے اور نقشہ' مذہب اور روایت' خواتین و حضرات' دو مناظر' خبر تحیر ہند)

۱۹- اکتوبر ۱۹۸۷ء

تعظیم کرکٹ' تکریم دانش' وزیر اعظم کی خصوصی توجہ (کچھ تبدیلیٔ قلوب بھی ہو' تکریم دانش اور پیچیدگیاں' وزیر اعظم کی خصوصی کمیٹی' تبدیلی قلوب)

۲۶- اکتوبر ۱۹۸۷ء

اہل قلم کانفرنس پر چند تاثرات ------ وزیر اعظم کے چار عظیم نکات (ایک میں دریا کی لہریں' دور کیا نزدیک کیا' وزیر اعظم کا خصوصی اقدام' سید سجاد حیدر)

۲۳- نومبر ۱۹۸۷ء

ادیبوں کا فنڈ' آمد و رفت اور دھند' دعوت و عدم' شرکت مشاعرہ' ایک تحریر جیٹ لیگ میں (فنڈ' دھند اور پہلا مشاعرہ)

۳۰- نومبر ۱۹۸۷ء

ایک پس منظر میں امریکی حالات ------- کچھ تاثرات یا سوالات (ہماری نئی نسلیں بھی فاؤنڈنگ فادرز بن سکتی ہے؟ تاثرات یا سوالات' وہ ایک کیوں ہے؟)

۷- دسمبر ۱۹۸۷ء

کچھ حقائق بے اثر ------- چھوٹے بڑے امریکی صوبے مگر (دو مرحومین پر فاتحہ' بحوالہ سابق' چھوٹے بڑے صوبے)

۸- دسمبر ۱۹۸۷ء

تبدیلیاں اور مصنفین ------- ترجیحات و قارئین (لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گزر گئے' ترجیحات اظہار' ہائی تھنکنگ)

۲۱- دسمبر ۱۹۸۷ء

امریکہ میں پاکستانی ------- مواقع' محنت' خوشحالی ("پختون معیشت و معاشرہ" تصنیفی کارنامہ ہے' مثالی خوشحالی)

۲۸- دسمبر ۱۹۸۷ء

عمل بر اقوال قائد ------- ذہن و دل کا جائزہ (وہ عظیم جلوس نیویارک)

۱۹۸۸ء

۴- جنوری ۱۹۸۸ء

گیا سال اور نیا سال ------- کچھ بحثیں' کچھ اقوال (اپنی حالت بدلتی ہے یا نہیں' اور اگلے سال)

۱۱- جنوری ۱۹۸۸ء

اسراف' قانون' تراشے ------- گرین کارڈ' چند غمناک تماشے (کبھی رضاکاروں کو آفرین بھی کہیں' گرین کارڈ دولہا دولہن' وطن دوست قبیلہ)

۱۸- جنوری ۱۹۸۸ء

بے بس فکریات' وہ دہ سالہ برسی (لندن سے اردو کتابیں' فکر اور خبر' لندن سے نئی کتابیں)

- فروری ۱۹۸۸ء

اصرار عرفیت------ حق اظہار (میلہ، حکایت، شکایت، بیدل، "جنگ" پر حملہ، وہ عجیب واقعہ، شہر لاہور، پی آئی اے، مدح و قدح بیدل از خواجہ عباداللہ اختر)

۸- فروری ۱۹۸۸ء

تصحیحات اور غلطیاں------ اک شمع جلانا (یا خدا یہ لوگ کون ہوتے ہیں، اک شمع جلانا، "گریز" ناممکن ہے، پاکستانی شہریت اور شہری)

۱۵- فروری ۱۹۸۸ء

کراچی، تجربات، حیرانی، کلیشے، منطق، اسراف (نواز شریف کا لائق تقلید اقدام، ڈھائی برس کے تجربات، منطق بھی گئی، جانیں اور کلیشے، دو مشاہدات، لاہور اور مطالبہ)

۲۲- فروری ۱۹۸۸ء

دباؤ اور پریشانی خیال------ واقعہ لاہور اور بنیادی سوال (کس کا دل ہوں کہ دو عالم میں لگایا ہے مجھے، واقعہ لاہور)

۲۹- فروری ۱۹۸۸ء

غلط فہمی، سفر بسی + شکایت گفتار، وحدت انکار (شہزاد احمد دو کتابیں، وحدت انکار)

۷- مارچ ۱۹۸۸ء

مشق خموشی - تجزیہ کوشی (تین کتابیں، ربط اور اکیل پن- پھر کتابیں، اردو ادب میں احتجاج، مکران، اردو لغت نمبر حصہ دوم)

۱۴- مارچ ۱۹۸۸ء

ایک خادم ادب، مسلسل تین رتجگے (مرداں چنیں کنند، انتظامات، ہمایوں اختر عادل)

۵- اپریل ۱۹۸۸ء

کچھ احوال کچھ سوال------ شام اودھ کا حال (لکھنؤ کا مثالی فیض احمد فیض سیمینار، لاعلمی نامہ، تبصرے، شام اودھ؟)

۱۱- اپریل ۱۹۸۸ء

ایک اور سفر------ احوال قطر (وہ پاکستان کو پاکستان دیکھنا چاہتے ہیں' بے نتیجہ بقراطی' حاضرین اور سفراء)

۱۸۔ اپریل ۱۹۸۸ء

سانحہ' اسباب' بلند ہمتی' ہم سب شریک ہیں (''عزیزو کاش مجھ کو بھی تمہارے ساتھ موت آتی'' حادثے اور اسباب بلند ہمتی------' جواب شکوہ)

۲۵۔ اپریل ۱۹۸۸ء

سانحہ پنڈی اور مستقبل بینی------ سندھی ثقافت و ادب پر دستاویز (سو اس حساب میں یہ بھی حساب ختم ہوا' مختصر مثالیں' سندھی ثقافت و ادب ------ایک دستاویز' میر مٹھا خان مری)

۲۔ مئی ۱۹۸۸ء

کچھ گلشن ادب کا کاروبار------ فیض عالمی سیمینار (شرکاء' عنوانات' تاثرات' فیض احمد فیض عالمی سیمینار' ہمہ گیری شرکاء' عنوانات مذاکرہ)

۹۔ مئی ۱۹۸۸ء

مشرق و مغرب سے سوال و جواب------ ایک نئی بڑی کتاب (پاکستانی جامعات' اکادمی ادبیات اور اعزازات' انکشاف اسلام' نفس مضمون' جامعات و اکادمی ادبیات)

۱۴۔ مئی ۱۹۸۸ء

بے بسی' بے حسی' بیمار' مخدوش' پچھلے اور آئندہ سانحے' مہلت' تعاون عظیم (اب ایک ''معاہدۂ کراچی'' ناگزیر بن چکا ہے۔ نقصانات اور پیمانے' بیمار' مخدوش یا یتیم خانہ' ایک اور عبدالستار ایدھی' گورنر یا وزیر اعلیٰ' ہاتھ اور گردن)

۳۰۔ مئی ۱۹۸۸ء

وہی سانحات وہی گزارشات------ ایک وجۂ فخر ایک کوہِ غم (کراچی امن کمیٹی کب بنے گی' خوفناک بیماری' سیاہ جوبلی' اقدامات' انکشاف' بے نیتی' نااہلی' مانیٹرنگ' ملیحہ لودھی' حسن حمیدی------ قول و کردار)

۱۳- جون ۱۹۸۸ء

زعمائے آزادی و دانش------ ذکر و فکر کی تراوش (گرمی، سرگرمی، جمہوریت اور جھولا، عیار دانش، یادِ اقوال، جھولے بغیر چڑھائی)

۲۲- جون ۱۹۸۸ء

اسلام آباد، گرمی، خیال ------ سوال در سوال در سوال (اے آرزو خرامی، وہ بھی ہیں، خود غرضانہ موازنے، پھر بقراطی)

۲۸- جون ۱۹۸۸ء

کرنٹ افیرز اور تاریخ------ توسیع فکر کے فرٹیلائزر (کاپی رائٹ قانون کی آمد، تاریخ کی تاریخ، فکر پھیلانے کے فرٹیلائزر، دانش وریا دانش جو)

۱۸- جولائی ۱۹۸۸ء

حالات و کیفیات ------ آئیڈیل نہیں مرتا (گھر واپس کب آئے گا؟ حالات و کیفیات، آئیڈیل نہیں رہ سکتا)

۲۰- جولائی ۱۹۸۸ء

قومی توانائی اور بحرانیات، مفاد پیوستہ کے داؤں گھات (آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں، مفاد پیوستہ کے داؤں گھات، چور اور مور)

۲- اگست ۱۹۸۸ء

روشنیاں اور اندھیرے------ افسروں کے ڈیرے (ہر شہر شہر ماست کہ شہر خدائے ماست، اندھیرے اور اسباب)

۱۱- اگست ۱۹۸۸ء

اعزازات کے گورکھ دھندے------ کتابیں اور قرضے (نعرے، مفادات پیوستہ اور طلسمات، اعزازات کا مسئلہ، کتابیں اور قرضے، نوے شارٹ کٹ نہیں، مفاداتِ پیوستہ اور قربانی)

۱۷- اگست ۱۹۸۸ء

اظہاریہ یا ہذیانیہ------ ذاتیات و قومیات (فلمیات، کرکٹیات، ستم، ہوائیں، معذوریں، ذاتیات و قومیات، کون سے معاملات)

۴- اکتوبر ۱۹۸۸ء

اولمپکس پر ایک خیال' ان کا ہمارا ماضی و حال (مورخ کزن کیا کہتا ہے؟ نیا رشک اور رنج' لذت و زوال' پاکستان کا انسان)

۱۱۔ اکتوبر ۱۹۸۸ء

تاریخی کانفرنس' ثبوت استقامت (خون' پانی' آزمائش' خود تعارفی' آزمائش اور ثبوت)

۱۸۔ اکتوبر ۱۹۸۸ء

دو سفید لکیریں------ کتابیں اور قرض حسنہ (کیا مستقبل آچکا ہے؟ سیاہ و سفید لکیریں)

۲۴۔ اکتوبر ۱۹۸۸ء

اسلام آباد کا درخت' طبقاتی تفریق (سندھ میں انتخابی امیدواروں سے مطالبہ' روزگار بنک اور بین اللسانی شادیاں' آمدن برسر مطلب' خرچ' انصاف اور بین الصوبائی شادیاں)

یکم۔ نومبر ۱۹۸۸ء

ہدف اور صدف ------ بین اللسانی میرج بیورو (تاریخ افتراق نہیں اتحاد کا بھی نام ہے۔ خلاصہ گفتگو' نعرے' تبلیغ' حقائق' بین اللسانی میرج بیورو)

۸۔ نومبر ۱۹۸۸ء

موج و طغیان' بندوں کے بندے (کئی سو کروڑ اور پانچ سو روپے' سمجھے کہ نہ سمجھے' کوئی بولے کہ نہ بولے' دھارا' طغیانی' خوش قسمتی' بے تکے سوالات' بڑے موضوعات' چھوٹا موضوع' رام ریاض)

۱۵۔ نومبر ۱۹۸۸ء

پرواز' افراد' آئیڈیاز' غیر جانبداری' جلاوطنی (ایک وصیت ادیبوں کے لئے' غیر جانبداری' جلاوطنی' دکھی اور سکھی لوگ' اجتماعی بیمہ زندگی و صحت)

۲۱۔ نومبر ۱۹۸۸ء

پاکستانی فاتح------ انقلاب یا ارتقاء (حزب اختلاف کی اہمیت' پاکستان فاتح ہوا' ارتقاء یا انقلاب' قبولیت نتائج)

۳۰- نومبر ۱۹۸۸ء

عظیم انتخابات' خاص رجحانات (مہاجرت' پاکستانیت' اور مستقبلیاتی فکریات' رجحانات' مہاجر فیکٹر' آنکھوں سے دیکھا)

۱۶- دسمبر ۱۹۸۸ء

تاریخ کی واپسی------ سبق' اقوال' انرجیا (ہم مائیں' ہم بہنیں' ہم بیٹیاں' ایک پورا قول' کچھ سیاست پر' انرجیا کا ہے پہر)

۲۳- دسمبر ۱۹۸۸ء

قومی انرجیا کی مثال------ کراچی کی صورت حال (رخنے اور سوال' قومی انرجیا کا سلسلہ)

۳۰- دسمبر ۱۹۸۸ء

تحریر و تقریر------ دوسری خبروں کا حق (سارک اور امیدیں' سیاست اور دوسری خبریں)

۱۹۸۹ء

۱۳- جنوری ۱۹۸۹ء

جمہوریت اور ترجیحات------ گولی اور گلاب (بے گناہی گفتنے نیست کہ آن جا باشد' سرکاری میڈیا اور مضامین' ترجیحات' حکومت شروع کرے' اگلے چار ارب' گولی اور گلاب)

۲۰- جنوری ۱۹۸۹ء

وہ خوبصورت زمانے------ کل' آج' کل کے سائے (ابن انشاء پر ایک شاندار کتاب' کل اور آج اور کل' دس برس ہو گئے' غلطی ہائے کمپیوٹر اور معذرت)

۲۷- جنوری ۱۹۸۹ء

اصل و فروع؟ طبقاتی جدوجہد (دور دانش آ کر رہے گا' طبقاتی جدوجہد' ۳۱ جنوری اور فروغ دانش)

۳- فروری ۱۹۸۹ء

جمہوریت' دانش' مرحلے' منزلیں (چند تجویزیں' منزلیں ------ مرحلے'

اقراء' تا حال ناکام منصوبہ)

۱۰- فروری ۱۹۸۹ء

طوفان' تعصب 'غلط فہمیاں' جنگل' حقائق' سوالات (کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلے کے' وفاقی مربیان دانش' تعصب اور بے تعصبی' ایم-کیو-ایم اور غلط فہمیاں' رامائن مہابھارت' ۱۹۸۹ء اور جنگل' این او سی اور ادیب)

۱۰- مارچ ۱۹۸۹ء

سفرِ ہند' کچھ تاثرات------ نئی لہر' مشکلات' احکامات (ان آنکھوں نے کوئی بھی اجالا نہیں دیکھا' نئی لہر' زیارات' ایک مشاعرہ اور شعر)

۱۸- مارچ ۱۹۸۹ء

کیفیات' اردو تجویز و تردید' وزیر اعظم اور مارچ کی پچاسویں سالگرہ (سر میں ہوائے گلشن' دل میں تمہاری یاد' وزیراعظم اور پچاسویں سالگرہ مارچ' بہ سلسلۂ ہندوستان' یادش بخیر)

۲۷- مارچ ۱۹۸۹ء

یہ مسلسل سانحات------ بے حسی مضمرات (کیا سب جانیں برابر نہیں ہوتیں' جان اور برابری' بے حسی اور مضمرات)

۳۱- مارچ ۱۹۸۹ء

قومیتوں سے الجھاؤ------ اصل مسائل پر آؤ (یک طرف جلتا ہے دل' اور یک طرف جلتا ہوں میں' تنبیہہ اور حوالے' غور فرمائیے' سرنگ اور روشنی)

۷- اپریل ۱۹۸۹ء

کراچی' حملے' بے نتیجہ بیانات------ رویے' پستی' گوادر' امکانات' تین برائے آغاز اور مبارک باد' مشترکہ سوالات وجوابات)

۱۴- اپریل ۱۹۸۹ء

سانحاتِ سندھ اور انتظار' فاؤنڈیشن' وزیر اعظم' توجہ (جو گرہ آپ نے کھولی' اسے مشکل باندھا' فاؤنڈیشن' وفاقی توجہ)

۲۱- اپریل ۱۹۸۹ء

مہنگائی اور "مسلم" سالگرہ، ایم۔کیو۔ایم کے مبارک اقدام، رضا ہمدانی کو سلام، تین قرض، "مسلم" سالگرہ، ایم کیو ایم کا نمونہ، پشاور کے جواہر)

۲۸۔ اپریل ۱۹۸۹ء

موضوعات اور وہ لڑکی، بے کاری، بیروزگار بنک (ورنہ بائیسویں صدی کا انتظار بھی لا حاصل ہو گا، وہ لڑکی، روٹین، اخلاقیات، تربیت اور روزگار بینک)

۶۔ مئی ۱۹۸۹ء

امید، سرمایہ، مباحثۂ عظیم، ہم یا وہ، مبارک اقدام، تالیاں اور ملکۂ ترکی (دوسرا معاملہ، "راز" کھولو، ایک خاص وجہ، تالیاں اور ملکۂ ترکی)

۱۲۔ مئی ۱۹۸۹ء

بقولِ چچل سرمست، ٹیپو سلطان اور حالات، نیلے ہاتھ (سب آنکھوں کے لئے، ٹیپو سلطان اور پاکستان، نیلے ہاتھ)

۱۹۔ مئی ۱۹۸۹ء

مضطرب احوال، اصل سوال (دھوئیں بھرے ہیں دلوں میں دماغ جلتے ہیں، اصل سوال، صرف ایک سبق، امیدیں، لمحۂ فکریہ)

۲۶۔ مئی ۱۹۸۹ء

ایک محقق، ایک ناقد (ٹی وی پر سندھ کے متعلق کھلا مذاکرہ، کون بلائے، ڈاکٹر معین الرحمان، بے ادب شرط، جاذب قریشی)

۲۔ جون ۱۹۸۹ء

گرمئ کراچی و لاہور ------ خلط بحث برائے غور کچھ ادب و ادباء، خلط صحبت

۹۔ جون ۱۹۸۹ء

بحث اور مایوس مخالفین، فکر حیات کے معاونین، اب اپنی بزم میں اہل سخن کی آزمائش ہے، امام خمینی، غلطیاں، معاہدے، وفاقی بجٹ ------ ایک تاثر، شہزاد احمد کا ایک ترجمہ)

۱۹۔ جون ۱۹۸۹ء

سمجھوتے، اصول، سوال------ ایک رجحان ساز مثال (ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سمجھوتے، اصول، سوال، باتیں، کام، مفت بازار، عدیم المثال خصوصیات)

۲۳- جون ۱۹۸۹ء

سوال، مثال، نظم------ مستقبل، سیاسی تعلیم (چند اہم فکری کتابیں، وہ نظم، آدم تا ایں دم، نفسا نفسی اور علم)

۳۰- جون ۱۹۸۹ء

متفرقات، سانحہ لاہور، دوستی، دشمنی (پاکستانی علامہ میمن عرب وہند میں، سانحہ لاہور، دوستی، دشمنی، دوستی، بے وقت کی راگنی)

۱۱- جولائی ۱۹۸۹ء

سندھ سے سرمائے کا فرار------ مزید بے روزگاری کے آثار (وزارت ثقافت اور قیمتی جانیں، خط اور بیروزگاری، توجہ)

۲۵- جولائی ۱۹۸۹ء

کراچی میں جون اور جنونی------ مولانا ایدھی اور انصار برنی (بجھی بجھی سی ہیں راہیں سراغ جلتے ہیں، آبدیدہ سوالات، تاریخ اور مستقبل، مولانا ایدھی اور انصاری برنی؟)

یکم- اگست ۱۹۸۹ء

غلطیاں، پنجابی، مجبوریاں، ۵-جولائی کے سبق (آزادیٔ اظہار کے خلاف ضوابط منسوخ کئے جائیں، پنجابی استحصالی، انتظار اور شہرت، پانچ جولائی اور سبق، مجبور زبانیں)

۴- اگست ۱۹۸۹ء

اکیسویں صدی، مرغ، قومیتیں، شاہ لطیف، محبت بولیں (محترمہ بے نظیر، بے نظیر، بے نظیر، اکیسویں صدی اور قومیتیں، فرمان علامہ اقبال"، گریجویٹ حکمران، پھر امید امن ہوئی)

۱۲- اگست ۱۹۸۹ء

"حقائق" المیہ، طربیہ------ ایک درخشاں منظرنامہ (جسے گھر میں رہنا

ہے وہ بنالے تو اچھا ہے' بانیان پاکستان مسترد؟ نوجوان مفکرین' مفکری اور معلومات' منظرنامہ اور چیلنج)

۲۲- اگست ۱۹۸۹ء

وزیر اعظم کا خطاب اور عمل------ یوتھ کونسل' ایک تجویز (علیؓ کی طرح جیو اور حسینؓ کی طرح مرو' وزیراعظم اور نئی نسل' مجموعی فکر کسے' لاہور' جھنگ رنگ)

۲۵- اگست ۱۹۸۹ء

سانحے' درد' عمل' بدامنی اور ڈیڈ لائن (وہ محبوب نظر آنے لگا' شناخت' درد' عمل' ڈیڈ لائن' تیل کی محبوبہ)

۲- ستمبر ۱۹۸۹ء

نوکر' بسیں' جائیں' حادثے' پیش بینی (مسلسل مطالبے کئے جائیں' حادثہ' اتفاق' پیش بینی)

۱۴- ستمبر ۱۹۸۹ء

معذرت' حقائق' اصول------۶- ستمبر پھر تازہ (سلیم احمد کو سلام)

۱۷- ستمبر ۱۹۸۹ء

یک جہتی کا جنون' پھر وہی مضمون (ایم- کیو- ایم کی خدمت میں' اور دوسرے شہر' قومی یک جہتی------ نعرہ و عمل' ایم- کیو- ایم کی خدمت خلق)

۲۳- ستمبر ۱۹۸۹ء

جمہوریت پر مباحث' یقین دہانی' واقعۂ پیرس (کتاب' قائد اور ہماری منافقت' جمہوریت اور یقین دہانیاں' پیرس کا واقعہ' قول قائد' فرض' منافقت)

۲۹- ستمبر ۱۹۸۹ء

صدرِ مملکت' وزیر اعظم' چیئرمین سینٹ' سینئر وزیر اور بیانات (قومی اسمبلی' یا دو تفتیش' ڈاکٹر ہلال نقوی' چار بڑے اور خلائے عمل)

۷- اکتوبر ۱۹۸۹ء

عدل، صوبے، مصلح الدین------ کاپی رائٹ ہولڈرز، توجہ (دو فرزندان سرحد کو کراچی سے نشان سپاس، عدل کیا ہے؟ مصلح الدین، کاپی رائٹ ترمیمات------ ہوشیار، کراچی، اردو، پشتو)

۲۸- اکتوبر ۱۹۸۹ء

بچے اور زہرا نگاہ------ پی آئی اے اور تبدیلیاں (وہ ایسے کیوں اور ہم ایسے کیوں نہیں؟ پچاس اور ایک)

۴- نومبر ۱۹۸۹ء

بے نام پابندیاں------ گھر ہونے تک (نیویارک کے اے بی پراچہ زندہ باد، ہندو مسلم انسان، دوسری مثال)

۱۱- نومبر ۱۹۸۹ء

بنیادی اخلاقیات------ ایک زیر تخلیق کائنات (واشنگٹن میں سب پاکستانی، پاکستانی نکلے، وہ وقت واپس، تذکرہ امریکہ، صرف پاکستانی)

۱۸- نومبر ۱۹۸۹ء

تاریخ ادھر ہم ادھر------ مثالیں، تجویز، یادیں، سواد رومتہ الکبریٰ میں دلی کس کو یاد آئی، مثالیں اور وہی تجویز، بحث اور یاد، نام، الزام، نمازی)

۲۴- نومبر ۱۹۸۹ء

بحران اور پاکستان، "حاجی جانی رند" اور سوالات، کچھ ذکر ادبائے لندن، بحرانیات، حاجی جانی رند، کچھ لندن سے)

یکم- دسمبر ۱۹۸۹ء

پھر "حاجی جانی رند" اور شبہات، ٹورنٹو میں یوم فیض (وہ گھر انہیں نہیں ملتا جو گھر بناتے ہیں۔ ایک پرانی خبر، ٹورنٹو میں یاد فیض، کتابیں اور ایک شعر)

۹- دسمبر ۱۹۸۹ء

کچھ گڈمڈ مضامین، علم و محبت کے فرامین (اثر ہر بات کا ہر شخص پر یکساں نہیں ہوتا، بھاؤ تاؤ اور فلور کراسنگ، کچھ بقراطی، اردو میں سائنس کی قدریں، دو تقریبات)

۲۳- دسمبر ۱۹۸۹ء

ایک عجیب شام------ تین تاریخی نام (دانش؟ دولت؟ اقتدار؟ مکین سے شرف، سگ لیلیٰ)

۳۱- دسمبر۱۹۸۹ء

نارتھ امریکی مشاعرے------ اقتصاد و انسانیت (ہمارے بیٹوں کے المیے، سفراور قدریں، اقتصادی رشتے اور انسانیت)

۱۹۹۰ء

۷- جنوری ۱۹۹۰ء

نیا سال کیا؟------ پاکستان کیوں ٹوٹا (قوم، قومیت اور قومی یک جہتی پر مباحثے کا مطالبہ، پھر پاکستان کیوں نہ ٹوٹتا؟ ہم ناشکرے لوگ، وہ سوالات اور مثال)

۱۲- جنوری ۱۹۹۰ء

ایسی موتیں، ایسی شادیاں، وہ قانون اور اپلیں (علاج اور بیمہ، شادیاں، شادمانیاں، گمنام اور مشاہیر اموات، وہ بے نفاذ قانون اور اپیل)

۲۰- جنوری ۱۹۹۰ء

چانکیہ سیاسیات------ ہماری اخلاقیات (شاید وہ گلشن نا آفریدہ رہی ہے، امن و امان، راج نیتی کے چھ روپ، ڈھائی ہزار برس؟ مرحومین، خطوط غالب)

۲۶- جنوری ۱۹۹۰ء

پابندی اور حسن نظر------ خراج تحسین اور یاد (قومی اسمبلی کی مجلس قائمہ اور کاپی رائٹ کا مسودہ، عظیم ڈاکٹر فاطمہ شاہ، فیض صاحب اور سڑکیں، مجلس قائمہ، توجہ فرمایئے)

۳۰- جنوری ۱۹۹۰ء

سفر، تاثر، چھتری------ خراج تحسین اور یاد، (قومی اسمبلی کی مجلس قائمہ اور کاپی رائٹ کا مسودہ، کتابوں کی چھتری، شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج، لاہور، عظیم ڈاکٹر فاطمہ شاہ، فیض صاحب اور سڑکیں، مجلس قائمہ، توجہ فرمایئے)

۳- فروری ۱۹۹۰ء

آنکھیں اور تصورات------گلڈ کے نئے نتائج (چند نئے جرائد' بین الاقوامیت' وہی تجویز' جرائدی گیسٹ' ادبی میگزین)

۲۸- فروری ۱۹۹۰ء

بے بسی' خلا' اہل دل------ قانون کی لاقانونیت کو سند کیا (اٹھ گیا ہے' نیا قانون' غیر حاضری' چھوٹے جلسے' بڑے عزائم)

۱۱- مارچ ۱۹۹۰ء

دھلی کنونشن ۱۹۴۶ء------ انتخابی اخراجات اور ہیگل (تا اشتہا نسوخت نہ شد پختہ نان ما' دوسرا جشن' انتخابات اور اخراجات)

۲۶- مارچ ۱۹۹۰ء

جشن و احتساب------ اتفاق و افتراق (چشم امید ہے' روزن تیری دیواروں میں' جشن و احتساب' وہ مستقل سوال' تھکی ہوئی سچائی' خوشیاں' قوت' اخوت)

۲۳- اپریل ۱۹۹۰ء

تین ہفتے جدہ میں------ سوال' بخشیں' دعائیں (اب پاکستان ہماری دعاؤں پر قائم ہے' آج اور کل' ہیں زبان کے لئے)

۳۰- اپریل ۱۹۹۰ء

جوان قیادت------ چھوٹے دکھ بڑے دکھ (عید و دید' جوان قیادت' لمحہ فکریہ' مستقبل کا مستقبل؟ چھوٹا دکھ' بڑا دکھ)

۵- مئی ۱۹۹۰ء

تاثرات' بدنامی' نیک نامی' شکایات' وسوسے' (خلوص واقعی' بدنام منشیات' نیک نامی' شکایات' وسوسے' چند خاص افراد)

۱۲- مئی ۱۹۹۰ء

شکایت' اجازت' مستقبلیات' (بے غرضانہ تعلق کی چند ٹھوس مثالیں' شکایت' اجازت' مستقبل کا مستقبل' وہ خوبصورت لوگ)

۵- جون ۱۹۹۰ء

لندن میں کراچی------ ... رسل اور مولٹی نو (یہ کیا ہو رہا ہے' یہ

کیوں ہو رہا ہے' یہ کب تک چلے گا' پروفیسر رالف رسل' میرین مولٹی نو' کیا تعلیم کیا عمل)

۱۷۔ جون ۱۹۹۰ء

بے بسی' اجتماعی خود کشی؟------ خیال' سوال' مستقبل (فیڈریشن آف چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹریز سے اپیل' وقت کی مختصر تاریخ' مرحلہ وار خود کشی' خیال و سوال' مستقبل بھی آ رہا ہے)

۱۶۔ جولائی ۱۹۹۰ء

انتظار' بیکار------ ایک فلاحی مملکت (کالے کے معاملے میں گورے کا استعفیٰ' مملکت فلاحی کیا اور کیوں؟)

۲۱۔ جولائی ۱۹۹۰ء

لاشیں اور سانچے------ اتحاد عظیم (کیا تجرباتی دور کی کوئی معیاد مقرر ہو سکتی ہے؟ لاشیں' زخمے' سانچے' اتحاد عظیم؟ تجرباتیت)

۳۰۔ جولائی ۱۹۹۰ء

صرف تقریریں نہیں افہام و تفہیم بھی (عام تعلیم میں افواج کا تعاون------ ملک جاگیرانی کو سلام' اسٹیبلشمنٹ اور تعلیم' ایک بے اسناد ہیرو' مذاکرے اور نتائج)

۱۳۔ اگست ۱۹۹۰ء

سحر' تبدل------ تصور' تدبر (وہی قول' ہیگل برائے تفکر' تبدیلی' گریز؟ جائیں' جائیں)

۲۸۔ اگست ۱۹۹۰ء

طوطی' طمانچہ' گدی' ناگزیریت' اقوال' یہ کتاب آج کا فوری نصاب ہے (کرنٹ افیرز اور مثنوی' سفاکی' ناگزیریت' اخلاقیات' ایک کتاب فوری نصاب)

۳۔ ستمبر ۱۹۹۰ء

محاورہ' سوالی لاشیں------ افواہیں اور مکانات (کرار نوری اپنی وضع کے خاص انسان تھے' سوالی لاشیں' حروف آئندہ' واہ رنگیلے' سلیم احمد اور

کرار نوری)

۹- ستمبر ۱۹۹۰ء

وہی سانحہ وہی سوال------سنگترے یا مال (پارلیمانی جمہوریت' تدریجی یا مربوط پیکج' ضمیر پاکستان' جیسن اور سزا' خراج؟ جمہوریت' تدریجی یا پیکج' اصول و مفاد' معذرت' تصحیح' لمحہ فکریہ)

۱۷- ستمبر ۱۹۹۰ء

وہی غم' وہی ماتم------کہکشائیں اور ہم (مولوی محمد سعید ایک بڑے آدمی اور بڑی مثال ہیں' جان و جہان' تواتر اظہار کا دباؤ)

۲۴- ستمبر ۱۹۹۰ء

کراچی پر سیاہ چادر------وہی باون پتے یا بہتر حالات (کرار نوری' رام ریاض اور ادیب برادری' قائداعظم کا یوم وفات' وہی باون پتے)

۳۰- ستمبر ۱۹۹۰ء

نفسا نفسی' فاصلہ' وقت------عما لکم' اعما لکم' پاکستان کو ان پر فخر کا اظہار کرنا چاہئے (وقت' عما لکم------ایک نابغہ روزگار' زین العابدین خان اور گردے)

۸- اکتوبر ۱۹۹۰ء

آزمائش اور اعزاز شوکت------مستقبل کا مستقبل (با بہتہ الرئیس' مستقبل کا مستقبل)

۱۵- اکتوبر ۱۹۹۰ء

سوال در سوال------خاندان در خاندان' کل کی سوچ آج سے (معاہدہ؟ خاندان ہی خاندان' سوال در سوال' کل کی سوچ آج سے' سید الطاف علی بریلوی مرحوم)

۲۲- اکتوبر ۱۹۹۰ء

قومی وقار؟ خود کفالتی؟------نعرے' دم خم' قربانیاں' ادبا کچھ ادب کے حوالے سے (سرشار' سروانتے اور صدر ماؤ' خود کفالتی؟ اوکٹے ویوپاز' تنہائی کی بھول بھلیاں' "ظلمت نیم روز")

۱۸۔ دسمبر ۱۹۹۰ء

برف، ٹیکنالوجی------ دو سو برس اور دو سو برس، (شمالی امریکہ میں خامہ پھر انگشت بدنداں ہے، بجز بیاں، ٹیکنالوجی اور افراد، چند افراد عجیب)

۲۷۔ دسمبر ۱۹۹۰ء

بے ر.ٹیاں------ مختصرات------ سوال در سوال (کیا کہا جائے، چند مختصرات، سوال در سوال)

۳۱۔ دسمبر ۱۹۹۰ء

تضادات، مناظر، مواقع، محنت، امکانات، خطرات، کیا پاکستان میں اگلی دہائی، اگلی صدی پر بھی سوچا جا رہا ہے؟ (عجائب اور تضادات)

۱۹۹۱ء

یکم جنوری ۱۹۹۱ء

تضادات، مناظر، مواقع، محنت، امکانات، خطرات، کیا پاکستان میں اگلی دہائی، اگلی صدی پر بھی سوچا جا رہا ہے (چند پند سودمند، چند متفرقات)

۸۔ جنوری ۱۹۹۱ء

ہمہ جہتی اور یک زبانی------ ایک نمونہ کہانی، کمپیوٹر اور غلامی

۱۴۔ جنوری ۱۹۹۱ء

تقریبات، تاثرات، خطرات، پاکستانی لابی اور مشورے (اہلیت، ماحول، مواقع، تقریبات و تاثرات، لابی؟ امریکیات، معیشت------ ایک مشورہ)

۳۱۔ جنوری ۱۹۹۱ء

جنگ، اندرونی درندہ، وھیل مچھلیاں، معذرتیں، شکریہ، (وہیں رہیں گے بادن پتے جیسے بھی دو بانٹ، "شانو" کی تربیت، ٹوٹا ہوا پستول------ ناگزیریت------؟ معذرتیں، بدلی ہوئی حکومتیں)

۲۸۔ جنوری ۱۹۹۱ء

سی این این اور وزارت اطلاعات------ افتراق امہ نہیں اتحاد امہ، تضادات کا بھنور (تباہی اور اس کے بعد، افتراق امہ یا اتحاد امہ،

امریکہ میں دفاع و تبلیغ' اردو ے چند شعری تصویریں)

۴۔ فروری ۱۹۹۱ء

افواہیں' انصاف------ ہنگامیت اور فکریات (آئندہ کے لئے کیا سوچنا ہے' ٹیلی فونی بوقلمونی' بحران اور ترجیحات' ہنگامیت اور فکریات' کل کے لئے کیا' اندرونی منظرنامہ)

۱۳۔ فروری ۱۹۹۱ء

دعوے اور حقائق------ گریہ' نفاق' اتفاق (کیا اقتدار پڑھتا اور سوچتا ہے؟ افتراق یا اتفاق)

۲۰۔ فروری ۱۹۹۱ء

تاریخ بنانا یا لکھنا------ آثار الصنادید اور غالب خستہ' آجر کو اجیروں کا خراج تحسین ایک بڑا واقعہ ہے (بنانا اور لکھنا' کیا آج بھی؟ کیا ٹی وی سیٹ ہٹا دیں؟ پچاس برس اور کتابچہ ''دی نیوز'' کو خوش آمدید)

۲۷۔ فروری ۱۹۹۱ء

دو نہایت اہم کتابیں------ کرائے کے سپاہی' نام سے واقفیت' کام سے لاعلمی (دو نہایت اہم اشاعتیں' کرائے کے سپاہی' نویں برسی)

۶۔ مارچ ۱۹۹۱ء

سوالات بے شمار------ پراگندگی روزگار (بھوک' تنگی' بیمار دنیا' مولوئے' پراگندگی روزگار' توجہ اور تراکیب' اقوام متحدہ اور ناکامی)

۱۹۔ مارچ ۱۹۹۱ء

جانیں اور ماؤں کی گودیں------ اسلحہ سازی' دانش کا مشترکہ پلیٹ فارم (انتہائی غربت اور شارٹ کٹ' ماں کی گودیں' اعلیٰ اختیاراتی کمیشن' گزشتہ سے پیوستہ' تنہا ادیب)

۳۰۔ مارچ ۱۹۹۱ء

جانیں اور------ دانش کا مشترکہ پلیٹ فارم (انتہائی غربت اور شارٹ کٹ)

۲۴۔ اپریل ۱۹۹۱ء

کچھ سفر کا حال، زوال اور سوال (فضا بہتر مگر سرمایہ؟ سوال و جواب، مشرقی برلن پلو سڈ، معیشت اور تعاون)

۲۹- اپریل ۱۹۹۱ء

اردو اور جرمنی، وزیر اعظم کے دو عظیم اقدام (عزیز حامد مدنی کے نام پر ٹی وی کو چیلنج، اور دو جرمن محفلیں، دو بڑے قومی فیصلے، غم و احتجاج اور چیلنج)

۷- مئی ۱۹۹۱ء

۲۹ واں برس، کراچی میں تازہ ہوا (مشاعروں کے ساتھ مذاکرے بھی، نئی پابندیاں، مشاعرے اور گزارشات)

۱۵- مئی ۱۹۹۱ء

مشاعرے اور تفریحات ملتوی (افکار عالیہ، وہ بنیادی بات، دو تصحیحات، اگلے جلسے اور اپیل)

۲۲- مئی ۱۹۹۱ء

ابلاغی ترجیحات، آئیڈیل کی خرافات (اسپیکر لوگ، خبری، تبصراتی ترجیحات، آئیڈیل خرافات)

۲۸- مئی ۱۹۹۱ء

ادبی کوائف------ عالمتاب تشنہ (یہ منظرنامے، صدا بہ صحرا، نثری نشستیں، دل ہلتا ہے)

۵- جون ۱۹۹۱ء

حسن اسلام آباد، پیچیدہ اور مثالی لوگ (پاکستان کے مضبوط ستون، "اپنوں سے" بھی، مثالی افسران)

۱۲- جون ۱۹۹۱ء

مکان، لا مکان، زمیں------ یکجہتی اور اظہار (اب ترا امتحان ہے پیارے، بر سرزمین، یکجہتی اور تاخیر، بعض اور لیکن)

۱۹- جون ۱۹۹۱ء

گرمی، احساس، شرکت (باقی کہانیاں ہیں، شرکت بے احساس، تراشے بے پناہ ہیں)

۲۸- جون ۱۹۹۱ء

بنیادی علاج ------- کل اور آج، غلام حیدر وائیں زندہ باد (نئی صورت حال، دو آزمائشیں، قصیدہ در مدح جناب وائیں)

۹- جولائی ۱۹۹۱ء

فکر و خلا، خدمت، لیڈی گڈی وا، وزیر اعلیٰ پنجاب پاکستان کو زمین دیں (ایدھی ٹرسٹ، لیڈی گڈی وا، سرطان، تحقیق، بے مکان)

۱۶- جولائی ۱۹۹۱ء

نفسیات، آزادی ------- رواداری، قربانی (تین شدید خطرے اتحاد مانگتے ہیں، پرانی نفسیات، نئی نفسیات، تین شدید خطرے، اتحاد عظیم اور مشاورت)

۳۰- جولائی ۱۹۹۱ء

فکریات، نئی نسل، سندھ روزگار بینک، (حکومت اہل دانش سے بھی مشورہ کرے، نئی نسل کا مسئلہ، نئے قوانین اور علاج، معیار اقدار)

۶- اگست ۱۹۹۱ء

جمہوریت اور سامنے کی باتیں، اقتدار، ارتقاء، حکایتیں (اردو! کیا وفاقی وزارت تعلیم وضاحت کرے گی؟ اقتدار اور ارتقاء، کل، آج، کل، انگریزی بجائے اردو؟)

۱۴- اگست ۱۹۹۱ء

جشن پاکستان اور منافقت، بیانات، کھلے تضادات (ہمارے ماضی میں ہمارا مستقبل کیا تھا! ماضی میں مستقبل، بیرونی عناصر، پیس کور)

۲۷- اگست ۱۹۹۱ء

معیار ترقی؟------- ہمارا درجہ سوم (یہ امت خرافات میں کھو گئی)

۳- ستمبر ۱۹۹۱ء

خبریں اور افکار ------- واقعات اور اذکار (اتنا جانتا ہوں کہ لوگ جاننا چاہتے ہیں، چند بنیادی ناگزیریات، سوالات پر اردو مواد، اردو تاریخ، روس کی ضرورت، ہمارا تعلق)

۱۰۔ ستمبر ۱۹۹۱ء

خطرناک سوال ------ عجیب صورت حال (معلومات دو اور فیصلہ لو، خانہ انگشت بدنداں، منطق کیا مانگتی ہے، اصل مسئلہ، حصول اعتماد کے طریقے، گزشتہ اور متبادل)

۱۷۔ ستمبر ۱۹۹۱ء

ڈولی رقمیں، معاشی تعلیم، تشہیری اخلاقیات (مچھلی بچ کر جائے کہاں جب جل ہی سارا جال، مجبوری، بہانے، افسانے، ابلاغ، اخلاقیات؟ گزار کیسے ہو؟ اکنامک ایجوکیشن، نیم اسٹنٹی، سوالوں کا سوال)

۲۶۔ ستمبر ۱۹۹۱ء

رقموں کی واپسی، خواندگی، صرف احتجاج یا علاج (جی ہم تو صرف سیاست کھیلتے ہیں، علاج یا سیاست، مشترکہ فرائض، عام تعلیم کا دن اور باتیں، صرف ایک وحشت ناک اندازہ)

۳۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء

کچھ ہم پر بھی احسان ------ یا اہل خاندان (وزرائے تعلیم حقائق کیوں نہیں بتاتے، وہ، نااہلی یا عدم خلوص، ایک ہی خاندان، فیصلے اور عمل درآمد)

۱۶۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء

خواندگی ------ سید فخر امام تفصیل بتائیں (بلدیاتی اداروں اور امیدواروں کا ایک فریضہ، بحران میں اسٹنٹی، خواندگی مہم، بلدیاتی انتخاب اور ریکارڈ)

۲۶۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء

شکایت اے لالیکا ------ نوبیل انعام، کسانوں کو سلام (محض ایک نمونہ اے لالے لالیکا، کاپی رائٹ کا ترمیمی مسودہ، نوبیل انعامات، ایک مختصر سفر)

۳۰۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء

ہمارا ایٹم بم؟ ------ بالاخر ریفرنڈم (اب مباحثہ عظیم کیا جائے، ایک نازک مسئلہ، پہلا سوال، مخالفت، موافقت، لا بیان)

۵۔ نومبر ۱۹۹۱ء

ڈاکٹر عبدالقدیر خان' ملوک التجار کراچی؟ (عظیم مقاصد پر صرف گفتگو کافی نہیں' واہ ادائے کراچی' گفتگوئے عمل)

۱۳- نومبر ۱۹۹۱ء

صحافت کی نئی کہانی------ ژولیدہ بیانی (کیا طاقت گریٹ کرتی ہے یا خوف؟ وہ کیسے ہوں گے' بے خوفی' ایک غیر معمولی شخصیت' القاب و خطاب' نہ جسم نہ روح)

۲۷- نومبر ۱۹۹۱ء

پدرم سلطان بود' مگر اب اور آئندہ کیا' پدری' سلطانی' حیرانی' صرف سنانا اور چلے جانا' سوال میں جواب' کوئی پڑھے نہ پڑھے حرف مدعا کہئے)

۳- دسمبر ۱۹۹۱ء

سیاست' شرر کاری' مرگ مستقل' دل آزاری (خدارا اچھے کاموں کو اجاگر کیجئے' مدائن صالح' مرگ مستقل' وہ قابل غور فارمولا' عظیم' رحم دل' پنجاب)

۱۰- دسمبر ۱۹۹۱ء

صحافت' نیشنل کمیشن' تعلیمی پالیسی اور پارلیمانی؟ (لاہور میں سات دسمبر کا عظیم جشن ندیم' آر اینڈ ڈی' نیشنل کمیشن' دیگر فرائض' تعلیمی پالیسی' پارلیمانی کمیٹیاں' ندیم صاحب کو تہنیت)

کتابیات

۱ جمیل الدین عالی — نئی کرن، کراچی، ۱۹۵۹ء

۲ ایضاً — تنہائی کی عورتیں (شریک مترجم) الفتح پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۷۲ء

۳ ایضاً — جیوے جیوے پاکستان، لارک پبلشرز، کراچی ۱۹۷۴ء

۴ ایضاً — غزلیں، دوہے، گیت، مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۹۸۳ء

۵ ایضاً — لاحاصل، طبع اول ۱۹۷۴ء، مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۹۸۳ء

۶ ایضاً — ایشین ڈرامہ (شریک مترجم) نیشنل بینک آف پاکستان، کراچی

۷ ایضاً — دنیا مرے آگے، طبع اول ۱۹۷۵ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۸۳ء

۸ ایضاً — دوہے، مرتبہ ایم حبیب خان، مکتبہ جامعہ، نئی دلی ۱۹۸۳ء

۹ ایضاً — تماشا مرے آگے، طبع اول ۱۹۷۵ء، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

۱۰ ایضاً — صدا کر چلے، شاہکار بک فاؤنڈیشن، کراچی ۱۹۸۵ء

۱۱ ایضاً — دعا کر چلے، مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۹۸۷ء

۱۲ ایضاً — حرفے چند، انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۸۸ء

۱۳ ایضاً — سفرنامہ آئس لینڈ (شش ماہی غالب، کراچی) ۸۹- ۱۹۸۸ء

۱۴ اختر امان، سات رنگ، نصرت پبلشرز، اسلام آباد ۱۹۸۶ء

۱۵ انتظار حسین، ملاقاتیں، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۸۸ء

۱۶ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، بار اول ۱۹۸۵ء

۱۷ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفرنامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور ۱۹۸۸ء

۱۸ ایم- حبیب خان، جمیل الدین عالی------ فن اور شخصیت، علمی مجلس، دہلی ۱۹۸۸ء

۱۹ پرویز اختر شاد، سید سبط علی صبا... شخصیت اور فن، مقالہ برائے ایم اے (اردو) ۱۹۹۱ء

۲۰ حافظ لدھیانوی، جمال حرمین، جنگ پبلشرز، لاہور ۱۹۸۹ء

۲۱ حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۷ء

۲۲ حسن رضوی، ہم کلامیاں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۰ء

۲۳ حمیدہ سلطان احمد، خاندان لوہارو کے شعراء، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دلی ۱۹۸۱ء

۲۴ طاہر مسعود، ہم صورت گر کچھ خوابوں کے، مکتبہ تخلیق ادب، کراچی، بار دوم ۱۹۸۵ء

۲۵ عبدالقادر جیلانیؒ، سید، غنیۃ الطالبین، مطبع اسلامیہ، لاہور ۱۳۲۷ھ

۲۶ فیروزالدین، مولوی (مترجم) کشف المحجوب، فیروز سنز، لا س-ن

۲۷ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، بار دوم ۱۹۸۷ء

۲۸ محمد طفیل، محترم، ادارہ فروغ اردو، لاہور ۱۹۶۸ء

۲۹ مظفر عباس، ڈاکٹر، (مرتب) عجائبات فرنگ (یوسف خان کمبل پوش) مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۸۲ء

۳۰ معین الرحمٰن، ڈاکٹر سید، (مرتب) محمد نقوش، مکتبہ کاروان، ملتان، بار اول ۱۹۸۳ء

۳۱ معین الرحمٰن، ڈاکٹر سید، (مرتب) نثری ادب، نذر سنز، لاہور، بار اول ۱۹۸۶ء

۳۲ میرزا ادیب، مٹی کا دیا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۱ء

۳۳ وحید قریشی، ڈاکٹر، جدیدیت کی تلاش میں، مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۰ء

اخبارات و رسائل

۳۴ روزنامہ جسارت، کراچی، ۲۸- مئی ۱۹۸۲ء

۳۵ روزنامہ جنگ، لاہور

۱۹۶۳: ۲۹- مئی

۱۹۶۷ء: ۱۰- اپریل

۱۹۷۸ء: ۱۰- مارچ، ۲- جون

۱۹۷۹ء: ۱۵۔جنوری

۱۹۸۱ء: ۲۔ جنوری، ۹۔جنوری، ۱۶۔جنوری، ۲۰۔فروری، ۲۸۔فروری،
۶۔مارچ، ۲۰ مارچ، ۲۷۔مارچ، ۳۔اپریل، ۱۰۔اپریل، ۱۷۔اپریل،
۲۴۔اپریل، یکم مئی، ۸۔مئی، ۱۵۔مئی، ۳۰۔مئی، ۵۔جون، ۱۲۔جون،
۱۹۔جون، ۲۶۔جون، ۳۱۔جولائی، ۱۶۔اکتوبر، ۳۰۔اکتوبر، ۳۱۔اکتوبر، ۴
۔نومبر، ۱۳۔نومبر، ۱۹۔نومبر، ۲۰۔نومبر، ۲۷۔نومبر، ۶ ۔دسمبر، ۱۱۔دسمبر،
۲۵۔دسمبر

۱۹۸۲ء: ۱۴۔جنوری، ۵۔اپریل، ۱۸۔اپریل، ۱۲۔مئی، ۱۶۔مئی، ۲۷۔مئی،
۳۔جون، ۶۔جولائی، ۲۰۔اگست، یکم۔ستمبر، ۹۔ستمبر

۱۹۸۳ء: ۱۸۔فروری، ۹۔مارچ، ۱۵۔مارچ، ۳۰۔مارچ، ۱۳۔اپریل، ۲۔جون،
۱۸۔جون، ۱۲۔جولائی

۱۹۸۴ء: ۱۷۔جنوری، ۲۳۔جنوری، ۳۔فروری، ۱۱۔فروری، ۲۴۔فروری،
۴۔مارچ، ۱۶۔مارچ، ۳۰۔مارچ ۱۴۔اپریل، ۲۵۔اپریل، ۳۔مئی، ۱۱۔مئی،
۳۱۔مئی، ۱۰۔جون، ۱۸۔جون، ۲۵۔جون، ۵۔جولائی، ۲۷۔جولائی، ۶۔اگست،
۱۲۔اگست، ۲۰۔اگست، ۲۔ستمبر، ۱۱۔ستمبر، ۳۰۔ستمبر، ۱۳۔اکتوبر، ۱۷۔اکتوبر،
۲۷۔اکتوبر، ۶۔نومبر، ۱۳۔نومبر، ۲۶۔نومبر، ۲۔دسمبر، ۸۔دسمبر

۱۹۸۵ء: ۷۔جنوری، ۱۶۔جنوری، ۲۴۔جنوری، ۲۸۔جنوری، ۷۔فروری،
۱۲۔فروری، ۱۹۔فروری، ۲۶۔فروری، ۱۲۔مارچ، ۱۹۔مارچ، ۲۶۔مارچ،
۲۔اپریل، ۹۔اپریل، ۱۶۔اپریل، ۷۔مئی، ۱۴۔مئی، ۲۴۔مئی، ۲۸۔مئی،
۴۔جون، ۱۱۔جون، ۱۸۔جون، ۲۔جولائی، ۹۔جولائی، ۲۳۔جولائی،
۳۰۔جولائی، ۶۔اگست، ۱۳۔اگست، ۲۰۔اگست، ۲۷۔اگست، ۳۔ستمبر،
۱۷۔ستمبر، ۲۴۔ستمبر، ۸۔اکتوبر، ۱۵۔اکتوبر، ۲۴۔اکتوبر

۱۹۸۶ء: ۱۹۔جنوری، ۲۷۔جنوری، ۳۔فروری، ۱۰۔فروری، ۱۷۔فروری،
۲۴۔فروری، ۳۔مارچ، ۱۰۔مارچ، ۱۷۔مارچ، ۲۵۔مارچ، ۳۱۔مارچ،
۷۔اپریل، ۱۴۔اپریل، ۲۱۔اپریل، ۲۸۔اپریل، ۵۔مئی، ۱۲۔مئی، ۱۳۔جون،
۱۶۔جون، ۲۳۔جون، ۷۔جولائی، ۱۴۔جولائی، ۲۱۔جولائی، ۲۷۔جولائی،

۴-اگست' ۱۱-اگست' ۱۷-اگست' یکم ستمبر' ۸-ستمبر' ۱۵-ستمبر' ۲۲-ستمبر' ۲۴-اکتوبر' ۲-نومبر' ۹-نومبر' ۱۸-نومبر' ۲۴-نومبر' یکم دسمبر' ۸-دسمبر' ۱۵-دسمبر' ۲۹-دسمبر

۱۹۸۷ء: ۵-جنوری' ۱۳-جنوری' ۱۹-جنوری' ۲۹-جنوری' ۲-فروری' ۹-فروری' ۱۶-فروری' ۲۳-فروری' ۲-مارچ' ۹-مارچ' ۲۳-مارچ' ۳۰-مارچ' ۶-اپریل' ۱۳-اپریل' ۲۵-مئی' ۳-جون' ۲۱-جون' ۲۹-جون' ۶-جولائی' ۱۳-جولائی' ۲۷-جولائی' ۳-اگست' ۱۸-اگست' ۱۴-ستمبر' ۵-اکتوبر' ۱۲-اکتوبر' ۱۹-اکتوبر' ۲۴-اکتوبر' ۲۳-نومبر' ۳۰-نومبر' ۷-دسمبر' ۸-دسمبر' ۲۱-دسمبر' ۲۸-دسمبر

۱۹۸۸ء: ۴-جنوری' ۱۱-جنوری' ۱۸-جنوری' یکم-فروری' ۸-فروری' ۱۵-فروری' ۲۲-فروری' ۲۹-فروری' ۷-مارچ' ۱۴-مارچ' ۵-اپریل' ۱۱-اپریل' ۱۸-اپریل' ۲۵-اپریل' ۳-مئی' ۹-مئی' ۱۶-مئی' ۳۰-مئی' ۱۳-جون' ۲۲-جون' ۲۸-جون' ۱۸-جولائی' ۲۰-جولائی' ۲-اگست' ۱۱-اگست' ۱۷-اگست' ۴-اکتوبر' ۱۱-اکتوبر' ۱۸-اکتوبر' ۲۴-اکتوبر' یکم-نومبر' ۸-نومبر' ۱۵-نومبر' ۲۱-نومبر' ۳۰-نومبر' ۱۶-دسمبر' ۲۳-دسمبر' ۳۰-دسمبر

۱۹۸۹ء: ۱۳-جنوری' ۲۰-جنوری' ۲۷-جنوری' ۳-فروری' ۱۰-فروری' ۱۰-مارچ' ۱۸-مارچ' ۲۷-مارچ' ۳۱-مارچ' ۷-اپریل' ۱۴-اپریل' ۲۱-اپریل' ۲۸-اپریل' ۶-مئی' ۱۲-مئی' ۱۹-مئی' ۲۶-مئی' ۲-جون' ۹-جون' ۱۶-جون' ۲۳-جون' ۳۰-جون' ۱۱-جولائی' ۲۵-جولائی' یکم-اگست' ۴-اگست' ۱۲-اگست' ۲۲-اگست' ۲۵-اگست' ۲-ستمبر' ۱۴-ستمبر' ۱۷-ستمبر' ۲۳-ستمبر' ۲۹-ستمبر' ۷-اکتوبر' ۲۸-اکتوبر' ۴-نومبر' ۱۱-نومبر' ۱۸-نومبر' ۲۴-نومبر' یکم-دسمبر' ۹-دسمبر' ۲۳-دسمبر' ۳۱-دسمبر

۱۹۹۰ء: ۷-جنوری' ۱۴-جنوری' ۲۰-جنوری' ۲۴-جنوری' ۳۰-جنوری' ۳-فروری' ۲۸-فروری' ۱۱-مارچ' ۲۶-مارچ' ۲۳-اپریل' ۳۰-اپریل' ۵-مئی' ۱۲-مئی' ۵-جون' ۱۷-جون' ۱۶-جولائی' ۲۱-جولائی' ۳۰-جولائی'

۱۳-اگست، ۲۸-اگست، ۳-ستمبر، ۹-ستمبر، ۱۷-ستمبر، ۲۴-ستمبر، ۳۰-ستمبر، ۸
-اکتوبر، ۱۵-اکتوبر، ۲۲-اکتوبر، ۱۸-دسمبر، ۲۷-دسمبر، ۳۱-دسمبر

۱۹۹۱ء: یکم-جنوری، ۸-جنوری، ۱۴-جنوری، ۲۱-جنوری، ۲۸-جنوری، ۴
-فروری، ۱۳-فروری، ۲۰-فروری، ۲۷-فروری، ۶-مارچ، ۱۹-مارچ، ۲۰
-مارچ، ۲۴-مارچ، ۲۹-اپریل، ۷-مئی، ۱۵-مئی، ۲۲-مئی، ۲۸-مئی، ۵
-جون، ۱۲-جون، ۱۹-جون، ۲۸-جون، ۹-جولائی، ۱۶-جولائی، ۳۰-جولائی، ۶
-اگست، ۱۴-اگست، ۲۷-اگست، ۳-ستمبر، ۱۰-ستمبر، ۱۷-ستمبر، ۲۶-ستمبر، ۳
-اکتوبر، ۱۶-اکتوبر، ۲۶-اکتوبر، ۳۰-اکتوبر، ۵-نومبر، ۱۳-نومبر، ۲۷-نومبر،
۳-دسمبر، ۱۰-دسمبر

۳۶- پندرہ روزہ چنگاری، دھلی (کالم نگاری نمبر)، ۱۹۸۴ء
۳۷- ماہنامہ افکار، کراچی، (کنونشن نمبر)، مارچ ۱۹۵۹ء
۳۸- ایضاً جنوری ۱۹۸۵ء
۳۹- ماہنامہ اوراق، لاہور، خاص نمبر جون، جولائی ۱۹۸۸ء
۴۰- ایضاً جون، جولائی ۱۹۸۹ء
۴۱- ماہنامہ خوبصورت، کراچی، جولائی ۱۹۹۱ء
۴۲- ماہنامہ دید شنید، لاہور، مئی ۱۹۹۰ء
۴۳- ماہنامہ ہم قلم، کراچی، اگست ستمبر ۱۹۶۰ء
۴۴- تخلیقی ادب (۲)، کراچی
۴۵- تخلیقی ادب (۳)، کراچی، اکتوبر، نومبر ۱۹۸۳ء
۴۶- سیپ (شمارہ ۳۱)، کراچی
۴۷- شعور (شمارہ ۳، ۴) حیدر آباد (پاکستان)
۴۸- کاروان (۲) کراچی
۴۹- نیا دور (شمارہ ۷، ۸)، کراچی
۵۰- نئی قدریں (شمارہ ۴) حیدر آباد (شاعر نمبر) ۱۹۶۷ء
۵۱- سہ ماہی الزبیر، بہاولپور (سفرنامہ نمبر) ۱۹۶۲ء

۵۲۔ شش ماہی غالب، کراچی مشترکہ
شمارہ، جولائی تا دسمبر۱۹۸۸ء، جنوری تا دسمبر ۱۹۸۹ء

مکاتیب:

۱۔ جمیل الدین عالی بنام ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ۱۹۔ ستمبر۱۹۸۶ء
۲۔ جمیل الدین عالی بنام راقم الحروف ۲۳۔ ستمبر۱۹۹۱ء
۳۔ جمیل الدین عالی بنام راقم الحروف ۲۔ مارچ ۱۹۹۲ء

ملاقاتیں:

۱۔ جمیل الدین عالی : راقم سے گفتگو، ۲۹۔ نومبر۱۹۹۱ء
۳۰۔ نومبر۱۹۹۱ء، یکم۔ دسمبر۱۹۹۱ء، ۷۔ دسمبر۱۹۹۱ء
۲۔ جمال پانی پتی : راقم سے گفتگو، یکم۔ دسمبر۱۹۹۱ء، یوسف پلازا، کراچی
۳۔ محمد عمر : راقم سے گفتگو، ۳۰۔ نومبر۱۹۹۱ء، جم خانہ کلب، کراچی